انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو

مدیر مسئول: سید راشد حامدی —— مدیر: ابوالاعلی سید سبحانی

جلد:۲، شمارہ:۲، جون ۲۰۱۷ء / رمضان المبارک۔شوال المکرّم ۱۴۳۸ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی............نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی............لکھنؤ

انیس احمد فلاحی............جامعۃ الفلاح

فی شمارہ:	اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Ali,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Printed at**: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Abul Aala Sayyed**

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلیٰ سید سبحانی	۳
اسلام: حقیقی ترقی اور کامیابی کا ضامن	مولانا نسیم احمد غازی فلاحی	۵
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۲۳)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۱۶
افادات جلیل احسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۱)	ظفر احمد الاثری	۲۷
امت دعوت، نہ کہ امت لعنت	ذکی الرحمٰن غازی فلاحی	۴۹
مریم جمیلہ کے تہذیبی افکار	ضمیر الحسن خان فلاحی	۶۴
فرض محبت کا شاعر	سید راشد حامدی فلاحی	۷۰
مشاہیر کے خطوط	ادارہ	۸۴
شعر ونغمہ	محمد امین احسن	۸۷
	عزیز نبیل	
	ارشد جمال صارمؔ	
تعارف وتبصرہ	سعید اختر اعظمی	۹۰
آپ کے خطوط	قارئین	۹۳
اخبار انجمن	ادارہ	۹۵

خط وکتابت وارسال زر کا پتہ

Zeeshan Apartment, F-9, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

Email: jareedahayatenau@gmail.com

موبائل نمبر (مدیر مسئول): +91-9811126467

موبائل نمبر (مدیر): +91-9891051676

اپنی بات

عام انسانوں کو درپیش سماجی مسائل کا حل پیش کرنے کے سلسلے میں زیادہ پرجوش اور متحرک قسم کے افراد کی طرف سے دورانِ گفتگو کبھی ایسا تأثر سامنے آتا ہے کہ دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کی جانب سے سماج کو درپیش مسائل کا حل پیش کردینا ہی فی الواقع مطلوب ہے اور اسے ہی اصل دعوتِ دین کا کام سمجھنا چاہیے، مزید یہ کہ توحید، رسالت اور آخرت جیسے عقائد کی دعوت کو ناگزیر نہ سمجھا جائے۔

اس سلسلے میں انبیائی دعوتوں کا، اور بالخصوص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہی انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت بنیادی طور سے یکساں تھی، وہ یہ کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو، یا دوسرے لفظوں میں اللہ کے سوا کوئی بھی معبود بننے کے لائق نہیں ہے، مثال کے طور پر ذیل میں چند آیات پیش ہیں:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ۔ (النحل:۳۶)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحاً إِلَى قَوْمِهِ إِنِّی لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ۔ أَن لاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ اللّهَ۔ (ھود:۲۵۔۲۶)

وَإِلَى عَادٍ أَخَاهُمْ هُوداً قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـهٍ غَيْرُه۔ (ھود:۵۰)

وَإِلَى ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحاً قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـهٍ غَيْرُهُ۔ (ھود:۶۱)

وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْباً قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـهٍ غَيْرُهُ۔ (ھود:۸۴)

یہ تمام ہی انبیاء کرام علیہم السلام کی بنیادی دعوت یا بنیادی جدوجہد تھی، جس کا ذکر بہت صاف انداز میں قرآن مجید میں جگہ جگہ ملتا ہے، تاہم قرآن مجید میں جن انبیاء کرام کی دعوتوں کا تفصیلی تذکرہ آیا ہے، ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عقائد کی بنیادی دعوت میں ان کے درمیان یکسانیت کے باوجود ان کی دعوتوں میں کچھ انفرادی خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔

قرآن مجید میں مذکور انبیائی دعوتوں کے مطالعہ سے یہ اہم اور بنیادی نکتہ سامنے آتا ہے کہ داعی کبھی اپنے سماج سے کنارہ کشی نہیں اختیار کرتا، وہ کبھی اپنے سماج کے حقیقی مسائل اور حقیقی ضروریات سے صرف نظر نہیں کرتا، بلکہ وہ سماج سے وابستہ رہتا ہے، سماج میں اس کی شخصیت ایک جانی پہچانی اصلاح پسند شخصیت ہوتی ہے اور سماج کو درپیش مسائل میں اس کا اپنا ایک ممتاز اور نمایاں رول ہوتا ہے، یہ چیز انبیاء

کرام علیہم السلام کی دعوتوں میں بھی ملتی ہے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی۔ قرآن وسنت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب سماج میں موجود اخلاقی برائیوں اور کمزوریوں کی جانب نہ صرف متوجہ کیا، بلکہ ان کی اصلاح کے لیے بھر پور کوششیں بھی کیں۔

دین کی دعوت دیتے ہوئے ایمانیات پر زیادہ توجہ دی جائے یا درپیش مسائل کے حل پر زیادہ توجہ دی جائے، اس میں سے کس پہلو کو ترجیح حاصل رہے، اور پھر یہ سوال کہ کیا مختلف سماجی حالات میں ترجیحات بھی مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں موجود مختلف قوموں کے درمیان انبیائی دعوتوں کے نمونے اپنے اندر رہنمائی کا کافی سامان رکھتے ہیں۔ قرآنی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائی دعوتوں کے یہ نمونے مختلف نوعیت کے انسانی سماجوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہر نبی کی دعوت میں پہلی ترجیح عقائد کی طرف دعوت کو ہی حاصل رہی ہے، اور یہ کہ تمام ہی نبیوں کے دعوتی نمونوں سے یہ پیغام ملتا ہے کہ داعی سماج میں ''ناصح اور امین'' کی شناخت اور پہچان بنائے، وہ سماج کا ایک بہت ہی فعال اور مانوس چہرہ بن جائے، وہ سماج کو درپیش مسائل اور سماج میں موجود برائیوں پر خاموشی اختیار کر کے بیٹھا نہ رہ جائے، بلکہ ہر محاذ پر اپنا داعیانہ کردار ادا کرتا رہے، اس طرح کہ ہر محاذ پر اسلام کی نمائندگی کرے، نہ صرف اپنے اخلاق و کردار سے، بلکہ اپنی گفتگو، اپنے میل جول، اپنے فیصلوں اور اپنی تمام سرگرمیوں سے۔ وہ اسلامی اقدار سے بھی لوگوں کو روشناس کرائے، اسلامی بنیادوں اور اصولوں سے بھی لوگوں کو واقف کرائے اور اسلامی عقائد سے بھی۔ لیکن وہ اس بات کو ہمیشہ ذہن میں مستحضر رکھے کہ اسلام جو تبدیلی لانا چاہتا ہے اس کی بنیاد عقائد پر ہے، عقیدہ توحید اور عقیدہ آخرت یہ وہ عقائد ہیں جو انسانوں کے رویوں اور سلوک میں غیر معمولی تبدیلی لاتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ہم اپنے اندر داعیانہ کردار پیدا کریں، اور اس داعیانہ کردار کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔ داعیانہ کردار کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی دعوت کی چلتی پھرتی تصویر بن جائیں، ہمارا قول و عمل، ہمارا اخلاق و کردار، ہمارے معاملات، ہمارا ذہن، اور ہماری تمام سرگرمیوں کا محور و مرکز دین کی دعوت بن جائے۔ اور ہمارے اندر وہی داعیانہ تڑپ پیدا ہوجائے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے یہاں پائی جاتی تھی۔ اگر یہ داعیانہ کردار عام ہو جاتا ہے تو آگے کا مرحلہ داعی کے لیے آسان ہوجائے گا، وہ اپنے مخاطب اور اپنے موقع ومحل کے اعتبار سے دیکھے گا کہ اسے کب اور کس موقع پر کیا گفتگو کرنی ہے۔

(ابوالاعلی سید سبحانی)

اسلام: حقیقی ترقی اور کامیابی کا ضامن

مولانا نسیم احمد غازی فلاحی سے خصوصی انٹرویو

مولانا نسیم احمد غازی فلاحی کا نام ہندوستان میں دعوت دین کی جدوجہد کے سلسلے میں ایک نمایاں نام ہے، موصوف اس میدان میں تقریباً نصف صدی سے نہ صرف عملی طور پر سرگرم ہیں، بلکہ علمی وفکری پہلو سے بھی آپ نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ موصوف اسلامی ساہتیہ ٹرسٹ اور مدھر سندیش سنگم جیسے معروف دعوتی اداروں کے روح رواں ہیں۔ آپ سے یہ خصوصی انٹرویو مدیر حیات نو نے ایس آئی او آف انڈیا کی کل ہند دعوتی مہم کے تناظر میں لیا تھا، افادۂ عام کے لیے اسے شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔

کیا آپ اپنا مختصر تعارف کرانا پسند کریں گے؟ آپ دعوتی میدان سے کب اور کیسے وابستہ ہوئے؟

میری دینی تعلیم جامعۃ الفلاح میں ہوئی۔ دوران تعلیم سے ہی میری سوچ یہی رہی ہے کہ میرے ہم وطن میرے بھائی ہیں اور ان کے مسائل میرے مسائل ہیں۔ بھائی ہونے کے ناطے میری ذمہ داری ہے کہ میں ان کی خیرخواہی کروں۔ جس چیز میں مجھے اپنی بھلائی اور نجات نظر آتی ہے، میرا فرض ہے کہ میں اپنے غیرمسلم بھائیوں کو بھی اس سے واقف کراؤں اور اس پر غور وفکر کی انہیں دعوت دوں۔ دینی تعلیم سے فراغت کے بعد جماعت کے مرکز میں مجھے خدمت کا موقع مل گیا۔ اُس وقت سے ہنوز اللہ دعوت کا کام لے رہا ہے۔ اس وقت خاص طور سے ہندی زبان میں اسلامی لٹریچر کی تیاری کے کام کی نگرانی میرے ذمہ ہے۔ ایک ضروری بات یہ بھی عرض کردوں کہ یہ سب کچھ صرف اور صرف اللہ کی مہربانی سے ہوا، فالحمدللہ رب العالمین!

اس وقت جبکہ ملکی وعالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کی تصویر مسخ کرنے کی سازشیں رچی جارہی ہیں، اس کے باوجود اسلام کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھ رہا ہے، آپ کی رائے میں اس کی کیا وجوہات ہیں؟

اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ اسلام جس وقت حضرت محمدؐ پر نازل ہوا، اس وقت کے حالات آج سے کہیں زیادہ سنگین تھے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ حق پھیلتا ہی گیا۔ اس کی کچھ وجوہات ہیں:

(i) لوگوں کو ہدایت دینے کی ذمے داری خدا نے اپنے ذمے لی ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم

اپنے عمل اور قول سے حق کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔

(ii) اسلام کے پھیلنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی تعلیمات بہت سادہ، عام فہم، نہایت موثر اور فطرت کے عین مطابق ہیں۔اس کی تعلیمات کی خوبی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچ کر رہتی ہیں۔ میری بات کے ثبوت میں اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے اور آج بھی اس کے نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ سماج کے مختلف طبقات اور گروہ کے لوگ جب اسلام اور قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سے لوگ اس کو اپنانے کے لیے خود کو مجبور پاتے ہیں۔

ایک خاص بات یہ سمجھنے کی ہے کہ جب آدمی کا ذہن اسلام کے بارے میں پراگندہ کردیا جاتا ہے اور پھر اس آدمی کو اسلام کا مطالعہ کرنے کا موقع میسر آتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ اسلام کے بارے میں سنا کیا تھا اور درحقیقت وہ ہے کیا! اور پھر مخالفین کی عیاریاں اور مکاریاں، جھوٹ اور فریب کو دیکھ کر اس کا ضمیر ان لوگوں پر افسوس کرنے لگتا ہے اور وہ اسلام کا گرویدہ ہوجاتا ہے۔اسی لیے قرآن نے اور پیغمبرؐ نے بار بار کہا کہ پہنچادو چاہے ایک آیت ہی ہو۔

(iii) انسان فطری طور پر حق پسند ہوتا ہے اور امن وسلامتی چاہتا ہے، مگر حق سے ناواقف ہونے کے باعث غیر حق کو حق سمجھ بیٹھتا ہے، جس شخص یا ادارے سے اسے توقع ہوتی ہے کہ شاید اس کے یہاں اسے اپنی مطلوبہ چیز مل جائے گی، وہ اس کی طرف رجوع ہوجاتا ہے۔لیکن جب کبھی اسے واقعی حق مل جاتا ہے تو پھر اپنے ضمیر کی آواز پر وہ اسے قبول کرلیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ مٹی میں ملے لوہے کے ذرات مقناطیس کی طرف کھنچ کر چلے آتے ہیں، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ حق کو قولی اور عملی طور پر پیش کیا جائے۔

اگر اہل اسلام کی عملی زندگی اسلام کے مطابق ہوجائے تو آپ دیکھیں گے کہ مخالفین کی باتیں دھواں بن کر اُڑ جائیں گی اور لوگ بڑی تعداد میں دین رحمت کے سایے میں آنے لگیں گے۔(ان شاءاللہ)

مسلم امت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا امت مسلمہ بحیثیت مجموعی اپنا دعوتی فریضہ انجام دے رہی ہے؟

یہ سوال اگر آپ مجھ سے نہ پوچھتے تو بہتر تھا۔اس لیے کہ میرا زخمی دل جب امت کے دعوتی کردار کے بارے میں سوچتا ہے تو وہ اس طرح تڑپتا ہے گویا اس پر نمک پاشی کردی گئی ہو۔اس کے باوجود اگر آپ اس سوال کا جواب مجھ سے چاہتے ہی ہیں تو میں چند باتیں علماء اور افراد امت سے معذرت کے ساتھ عرض کروں گا۔میں یہ باتیں کسی جذباتی ردعمل کے طور پر نہیں بلکہ اپنے غور وخوض، حقیر سے مطالعے اور مشاہدے کی روشنی میں عرض کررہا ہوں۔

سب سے پہلی بات مجھے یہ کہنی ہے کہ ہمارے علماء کرام، دانشوران عظام اور ملت کے اصحاب حل وعقد اس غلط فہمی کے شکار ہو گئے ہیں کہ دعوتی کام یعنی لوگوں کو جہنم سے بچانے اور جنت کا مستحق بنانے کا کام، سب کے کرنے کا نہیں بلکہ کچھ لوگ اگر اس کو انجام دے دیں تو بس کافی ہے۔ یعنی یہ کام فرض کفایہ ہے۔ اس کی دلیل ان حضرات کے پاس اس کے سوا کوئی نہیں کہ قرآن میں سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۴/ میں ارشاد ہوا ہے: وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُون ۔ اور ان کے نزدیک اس میں مذکور 'من' سے مراد کچھ لوگ ہیں۔ یعنی 'من' تبعیض کے لیے ہے۔ جبکہ خود قرآن میں حرف 'من' تبیین کے لیے بھی متعدد بار استعمال ہوا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسی آیت میں وَأُولَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُون بھی فرمایا گیا ہے کہ ''اور دراصل یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔ یہ فقرہ خود بتا رہا ہے کہ یہاں معاملہ ''کچھ'' کا نہیں ''سب'' کا ہے۔ نیز چند آیتوں کے بعد یہ بھی فرما دیا گیا کہ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّه۔ (آل عمران، آیت: ۱۱۰) یعنی ''تم بہترین امت ہو جو سارے انسانوں کے لیے وجود میں لائی گئی ہو، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر اللہ میاں یہاں صاف صاف الفاظ میں فرما دیتے کہ سب کو یہ کام کرنا ہے اور لازماً کرنا ہے تب بھی امت کا رویہ کم وبیش وہی رہتا جو آج ہے۔ جیسا کہ بہت سی تعلیمات اور فرائض کے بارے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

ان حضرات کی جانب سے ایک 'عقلی' دلیل یہ دی جاتی ہے کہ غیر مسلم بھائیوں کو حق کی طرف بلانے کا کام ہر شخص کے بس کا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے تو بڑی قابلیت، بڑی اونچی صلاحیت اور مہارت کی ضرورت ہے۔ پھر ملت میں بہت سے معذور اور کمزور لوگ ہیں یا ہو سکتے ہیں، اگر دعوتی کام کو سب کے لیے ضروری قرار دے دیا جائے گا تو آخر یہ لوگ اس فرض کو کیسے ادا کر پائیں گے۔

یہ دلیل بھی بڑی بودی ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا کہ یہ حضرات دراصل دعوتی کام کی نوعیت کو سمجھ ہی نہیں پاتے ہیں، البتہ اگر سوئے ادب نہ ہو تو یہ عرض کروں گا کہ یہاں بھی وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ تجربات شاہد ہیں کہ جو لوگ ان حضرات کی رائے میں ''بے صلاحیت'' اور ''معذور'' ہیں، انہوں نے اس میدان میں شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ ایک مسلمان جب اسلام کی تعلیمات کے مطابق اچھا کردار پیش کرتا ہے یا کوئی کتاب یا کتابچہ دعوتی تڑپ کے ساتھ کسی کو پڑھنے کے لیے دیتا ہے، تو یہ بھی دعوت کا ایک طریقہ ہے۔ دعوتی کام کی کوئی ایک یا چند متعین شکلیں نہیں ہیں۔ (دیکھیں

میری کتابیں: دعوتی تجربات، اول ودوم)

دوسری مغالطہ آمیز بات یہ ذہنوں میں بٹھائی جاتی ہے کہ ''بھائی پہلے اپنی اصلاح کر لی جائے، غیروں میں دعوت بعد میں دیں گے۔''

تیسری بات یہ کہ ملت کی بہت بڑی اکثریت، عملاً دعوتی کام سے غافل بلکہ بے نیاز ہے۔

مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ دعوتی کام کے پہلو سے امت مسلمہ مجرمانہ غفلت کا شکار ہے۔

کیا ملک میں دعوت دین کے جو مواقع موجود ہیں وہ مسلم امت کے لیے غنیمت یا بہترین مواقع نہیں ہیں؟ امت کے درمیان دعوتی فکر کو کیسے عام کیا جاسکتا ہے جبکہ علماء تک اس سلسلے میں غلط فہمی کا شکار ہیں؟

ملک عزیز میں ملت کو دعوت کے جو مواقع حاصل ہیں وہ بہت غنیمت ہیں۔

جہاں تک امت کے درمیان دعوتی فکر کو عام کرنے کی بات ہے تو میرے خیال میں امت کے اندر یہ کام انجام دینا آج نسبتاً زیادہ سہل ہے۔ اس لیے کہ موجودہ حالات نے امت کو اس پہلو پر سوچنے کے لیے آمادہ کیا ہے۔ نیز علماء بھی اب اس سلسلے میں سوچنے لگے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ لوگ اپنے کو اس کام کے لیے وقف کریں، اور وہ دعوتی کام کے پہلو سے ملت کو بیدار کریں۔ جماعت اور ایس آئی او اس کام کو اپنے پروگرام کا اہم حصہ بنائیں۔ وہ علماء اور دیگر لوگوں سے رابطہ کرکے اس پہلو سے بیداری پیدا کرنے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ دعوتی کام کے لیے ملت سے افراد بھی ملیں گے اور مالی قوت بھی حاصل ہوگی۔

کیا ملک میں اس وقت تحریک اسلامی کے پاس جو دعوتی لٹریچر موجود ہے وہ کافی ہے؟ یا اس میں مزید کسی پیش رفت کی ضرورت ہے؟

بے شک تحریک اسلامی کے پاس جو دعوتی لٹریچر موجود ہے وہ قابل قدر ہے اور اب تک دعوتی میدان میں اسی سے کام لیا بھی جارہا ہے۔ لیکن موجودہ حالات کے پیش نظر نئے لٹریچر کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور پر بھارت کی مذہبی کتب اور مذہبی روایات اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر نئے لٹریچر کی اشد ضرورت ہے۔ اسی طرح برادران وطن کے ذہن کو پیش نظر رکھ کر قرآن مجید کی تفسیر نیز سیرت پر آپ ؐ کی تعلیمات کی روشنی میں کتابوں کی ضرورت محسوس ہوتی۔ آج کے نئے معاشی، سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور ماحولیاتی وغیرہ مسائل پر بھی اسلامی لٹریچر کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایسے افراد کی ٹیم تیار کرنے پر فوری توجہ درکار ہے جو اصل مراجع سے رجوع کرکے جدید اسلوب میں لٹریچر تیار کر سکے۔ ملت کے باصلاحیت نوجوانوں کو اس میدان میں خدمت کے لیے آگے آنا چاہیے۔

دعوت دین اور سماجی مسائل کے سلسلے میں قائدانہ کردار، یہ دو چیزیں ہیں، انبیاء نے اپنے زمانے میں دونوں کو ایڈریس کیا ہے، ہم اس کے درمیان کیسے ہم آہنگی پیدا کریں، دیکھنے میں آتا ہے کہ ہم سماجی مسائل میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور اس میں دعوتی پہلو نظر انداز ہو جاتا ہے، اور ہم عام سوشل ورکر بن کر رہ جاتے ہیں۔

دعوت دین اور سماجی مسائل کے حل کے لیے کوششیں دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں۔ نبیؐ نے دعوت دین کا آغاز سماجی مسائل کے حل سے ہی کیا ہے اور یہی فطری طریقہ ہے۔ داعی حسب موقع جیسا حکمت کا تقاضا ہو کہیں سے بھی کام کا آغاز کر سکتا ہے۔ جہاں تک آپ کا یہ اندیشہ یا مشاہدہ ہے کہ سماجی مسائل کے حل میں الجھ کر آدمی صرف سوشل ورکر بن کر رہ جاتا ہے، تو دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے ذہن میں دعوت کی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ اگر دعوت کی اہمیت وضرورت کا احساس آدمی کو رہے تو پھر وہ ہر کام میں دعوتی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جس شخص کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے گی کہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ جہنم کی آگ سے بچنے کا ہے اور انسان کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اسے جہنم کی آگ سے بچا لیا جائے تو پھر وہ اپنے اصل مقصد سے کبھی غافل ہو ہی نہیں سکتا۔

ترقی کا ایک مادی ماڈل وہ ہے جو آج کی دنیا میں رائج ہے۔ جس سے تنگ آ کر لوگ مختلف انداز سے روحانیت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں؟ اسلام کا اس سلسلے میں کیا موقف ہے؟ یا اسلام کی رو سے ترقی کا کیا مفہوم ہے؟ اور اس کو بنیاد بنا کر ہم کس طرح دعوتی کام کو آگے بڑھا سکتے ہیں؟

ترقی کا مادی ماڈل جو آج دنیا میں رائج ہے، لوگ اس سے تنگ آ کر روحانیت کی طرف بھاگ رہے ہیں، یہ سوچنا دراصل ہماری غلط فہمی ہے۔ بظاہر روحانیت کی طرف دلچسپی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مادیت کے جو بد اثرات مختلف پہلوؤں سے انسان اور انسانی سماج پر پڑتے ہیں تو آدمی ان سے بچنے کے لیے ہر اس شخص یا ادارے کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس سے اسے امید ہوتی ہے کہ وہ ان بد اثرات سے اسے محفوظ کر دے گا۔ لیکن وہ کسی طرح بھی مادیت کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ جہاں وہ امن وسکون کی تلاش میں جاتا ہے وہاں اسے مادیت سے چھٹکارے کی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ اسے کچھ نام نہاد امن وسکون کے طریقے بتا کر مزید مطمئن کر دیا جاتا ہے کہ وہ مادیت میں ڈوبا رہے اور ہمارا حصہ بھی ہمیں پہنچاتا رہے۔ ایسے سبھی لوگوں کو حقیقی امن وسکون دراصل اپنے خالق ومالک خدا کے بھیجے ہوئے ضابطہ حیات یعنی اسلام کی تعلیمات میں ہی مل سکتا ہے۔ صحیح تصور آخرت کے بنا حقیقی امن وسکون کی تمنا کرنا اپنے کو دھوکے میں ڈالنا ہے اور اسلام نے آخرت کا جو تصور پیش کیا ہے اسے تسلیم کر کے ہی حقیقی امن وسکون اور زندگی کا صحیح لطف حاصل کیا

جاسکتا ہے۔لیکن خود مسلمانوں کا ایک خاصا طبقہ اس فریب میں مبتلا ہے کہ روحانی اور دینی پیاس بجھانے کے لیے کچھ مذہبی امور انجام دے دیے جائیں اور بقیہ زندگی پوری آزادی سے گزاری جائے۔یعنی دینی ضرورت پوری کرنے کے لیے وہ نماز، روزہ، حج اور کچھ ذکر واذکار اسلام کے مطابق کرلیں اور اپنے کاروبار، معاملات، شادی بیاہ، لین دین، اور حقوق العباد وغیرہ امور میں من مانی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طبقے کی مادیت پرستی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا کردار دعوت کے کام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ہم کسی کو صرف نظری طور پر کچھ سمجھا کر یا کچھ لٹریچر کا مطالعہ کرا کے اسلام کی حقانیت کا قائل نہیں بنا سکتے جب تک کہ مسلمانوں کی اکثریت عملی میدان میں اسلام کی نمائندہ نہ ہو۔

اس دور کا ترقی کا مادی ماڈل دراصل ایک سراب ہے، ایک دھوکہ ہے۔ترقی کے اس مادی ماڈل میں ایک طبقہ امیر سے امیر تر ہوتا جاتا ہے اور تمام سہولیات اور سارے عیش وآرام کو صرف اپنا حق سمجھتا ہے۔ دوسری طرف ایک طبقہ غریب سے غریب تر ہوتا جاتا ہے، اور وہ بنیادی ضرورتوں تک سے محروم رہتا ہے اور جس کے نتیجے میں وہ خودکشی کرنے تک پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کسی کے ایک آنسو پر ہزاروں دل تڑپتے ہیں کسی کا عمر بھر رونا یونہی بے کار جاتا ہے

ترقی کے اس ماڈل میں ماں باپ جیسی شفیق ورحیم ہستیوں کو اپنے عیش وآرام اور موج مستی میں حائل سمجھ کر انہیں 'اولڈ ایج ہوم' میں پھینک دیا جاتا ہے اور کتے، بلیوں کو اپنے بچوں کے ساتھ سلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ترقی کے اس ماڈل میں خالق کائنات کی نوازشوں اور نعمتوں کو باریک بینی سے تلاش کر کر کے ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، مگر اس بات کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ ان نعمتوں کو دینے والی ہستی کی بھی تلاش کی جائے اور معلوم کیا جائے کہ ہمارے رحیم وکریم خالق نے ہمیں اس دنیا میں کیوں بھیجا ہے؟ اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ اس ہستی نے ان عظیم نعمتوں کو ختم ہو جانے ہی کے لیے پیدا کیا ہے یا ان کے دوام کے لیے بھی کوئی تدبیر بتائی ہے؟

ترقی کے اس ماڈل کا اگر دیانتداری کے ساتھ پوسٹ مارٹم کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نہایت شاندار اور سنہری لباس میں غلاظت بھری پڑی ہے جس میں سے تعفن اٹھ رہا ہے۔

یہاں اس پر اس سے زیادہ اظہار خیال کا موقع نہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ترقی کے اس مادی ماڈل کا بھرپور جائزہ لے کر اس کی حقیقت کو سامنے لایا جائے۔

اسلام ترقی کا جو ماڈل پیش کرتا ہے، اس میں سارے انسانوں کو برابر کے حقوق دیئے جاتے ہیں، بلکہ پسماندہ طبقے کو زیادہ مراعات دی جاتی ہیں۔سب کے ساتھ انصاف ہوتا ہے اور انصاف پانا آسان

ہوتا ہے۔ترقی کے اسلامی ماڈل میں بوڑھے ماں باپ بوجھ نہیں بلکہ اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ ان کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔اس ماڈل میں عورت مجلسوں کی زینت اور عیش وسرمستی کا سامان نہیں، بلکہ گھر کی ملکہ اور سماج کے لیے محترم ہستی ہوتی ہے۔اسلامی ماڈل میں غم غلط کرنے کے لیے شراب کا سہارا نہیں لیا جاتا بلکہ ذکرالٰہی اور راتوں میں جاگ کر خدا کے آگے سربسجود ہوکر اس کا مداوا کیا جاتا ہے۔اس ماڈل میں خود کھانے سے پہلے دریافت کیا جاتا ہے کہ کہیں ہمارا پڑوسی بھوکا تو نہیں۔اسلام کی نظر میں وہ ترقی ترقی نہیں جو صرف اس دنیا تک محدود ہو۔وہ اس ترقی کا قائل ہے جس کے اثرات مرنے کے بعد والی زندگی تک پہنچتے ہوں۔اسلام کے نزدیک روحانیت اور امن وسکون کی تلاش ان کی 'دوکانوں' پر جا کر نہیں کرنی پڑتی، بلکہ اسلام نے زندگی گزارنے کا جو طریقہ بتایا ہے اور نبیؐ نے اس کو عملی جامہ پہنا کر ہمارے سامنے رکھا ہے، اس میں اسی دنیا میں رہتے ہوئے یہ مقصد حاصل ہوتا رہتا ہے۔

کیا دعوت دین ہماری سرگرمیوں کا مرکزی عنوان بن سکی ہے؟ اگر نہیں، تو اس کے سلسلے میں آپ کیا مشورہ دینا پسند کریں گے؟

عام مسلمانوں میں یہی بات پھیلائی گئی ہے کہ دعوتی کام فرض کفایہ ہے، اگر اسے چند لوگ بھی انجام دے دیں گے تو سب کی طرف سے ذمہ داری پوری ہوجائے گی یا پھر یہ سوچ عام کی گئی ہے کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرلو اس کے بعد دوسروں میں تبلیغ کرو۔ان حالات میں دعوتی کام امت کی سرگرمیوں کا مرکزی عنوان بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔البتہ تحریک سے وابستہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں۔تحریک نے شروع ہی سے اس کام کو فرض عین اور مسلمانوں کی اصل ذمہ داری قرار دیا ہے۔اس میدان میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور دی جارہی ہیں۔لیکن اس سب کے باوجود افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ عملاً ہمارے یہاں بھی یہ کام مرکزی اہمیت حاصل نہیں کرسکا ہے۔

جہاں تک اس سلسلے میں مشورہ دینے کی بات ہے تو یہی گزارش کروں گا کہ جتنی جلد ممکن ہو دعوتی کام کو زندگی کا مقصد بنالیجئے کیونکہ اس میں ہماری دنیا وآخرت کی کامیابی مضمر ہے۔یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دعوتی کام صرف تقریر کردینا، کتابیں تقسیم کردینا یا اس قبیل کے دیگر کام انجام دینے کا نام نہیں ہے۔بلکہ یہ ایک طریقہ زندگی (Art of Living) ہے۔یعنی ہمارا ہر کام اور ہماری ہر حرکت ایسی ہو جس سے نہ صرف ہم محظوظ ہوں بلکہ دوسرے بھی لطف اندوز ہوں، ہمارے دعوتی کردار کی مثال عطر سے بھری شیشی کی طرح ہے کہ اسے جہاں بھی اور جس وقت بھی کھولا جائے گا اس میں سے خوش بو ہی نکلے گی۔لوگوں سے ہمیں محبت ہو، ان کی دنیا وآخرت کی کامیابی کی فکر ہو، انہیں جہنم سے

بچانے کی چنتا ہو، اور ہم اسلام کی تعلیمات پر اس طرح سے عمل کریں جو مطلوب ہے تو پھر ہمارا ہر کام اسلام کی عملی شہادت بن جائے گا اور یہی اصل دعوتی کام ہے۔

دعوت دین کا عظیم فریضہ انجام دینے والوں کو کن بنیادی خوبیوں سے آراستہ ہونا چاہئے، تاکہ قولی دعوت کے ساتھ ساتھ عملی دعوت کا کام بھی جاری رہے؟

جو صفات اور خوبیاں اسلام ہر مومن کے اندر دیکھنا چاہتا ہے وہی صفات ایک داعی کے اندر مطلوب ہیں، کیوں کہ اسلام کی نظر میں ہر مومن داعی ہے۔ ان تمام مطلوبہ صفات کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔ قرآن مجید میں ان کی تفصیل موجود ہے۔ پھر بھی چند صفات کا تذکرہ یہاں کیا جارہا ہے:

☆ داعی کے اندر انسانیت کی نجات کے لیے سچی تڑپ موجود ہو اس طرح کہ اس کے اثرات اس کے اوپر نمایاں طور پر نظر آئیں۔

☆ حکمت بھی ایک داعی کے لیے لازمی صفت ہے۔

☆ صبر و تحمل کی صفت کے بغیر دعوتی کام ممکن نہیں۔

☆ اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی اور عفو و درگزر کی صفت بھی اس کام کے لیے ضروری ہے۔

☆ اللہ سے مضبوط اور زندہ تعلق قائم کیے بنا یہ کام ناممکن ہے۔

ہندوستان جیسے تکثیری معاشرے میں اسلام کا کیا مستقبل دیکھتے ہیں؟ یہاں مسلمانوں کی صورتحال اور دعوت دین کے سلسلے میں ان کی مجرمانہ غفلت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کیا کہیں گے؟

ہندوستانی معاشرے میں اسلام کا مستقبل نہایت تابناک ہے۔ یہ ہماری خوش فہمی نہیں بلکہ تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں یہ بات عرض کی گئی ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ مسلمان اسلام کی بحیثیت مجموعی قولی اور عملی شہادت کا فریضہ انجام دیں۔ وہ اپنے گھر، معاشرے اور سماج کی تعمیر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کریں۔ اس طور پر کہ لوگ ان کے معاشرے کو دیکھ کر یہ باور کرنے لگیں کہ درحقیقت یہی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ ہے، جس کی تقلید کئے بغیر نہ ہمیں کامیابی مل سکتی ہے اور نہ ملک کو ترقی۔ ان کوششوں کے بغیر خالی خولی باتیں کرنے سے دعوت کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ مگر افسوس اسی بات کا ہے کہ مسلمان سدھرنا نہیں چاہتے۔ دین اور اسلام کے نام پر انھوں نے چند باتوں کو منتخب کرلیا ہے، اور اسی پر وہ مطمئن ہیں۔ جتنی جلد مسلمان اسلام کا عملی نمونہ اپنی زندگیوں میں پیش کرنا شروع کردیں گے اتنا ہی ان کے حق میں بہتر ہوگا۔

ملک میں فاشسٹ طاقتیں مستقل تبدیلی مذہب مخالف قانون بنانا چاہتی ہیں تاکہ مذہب کی تبلیغ کا راستہ بند کیا جاسکے، کیونکہ اس سے ماحول خراب ہوتا ہے اور سماج میں مختلف قسم کے خطرناک مسائل جنم

لیتے ہیں،آپ اس بارے میں کیا سوچتے ہیں؟

ملک کے بعض حصوں میں پہلے ہی تبدیلی مذہب کے سلسلے میں کچھ شرائط لگادی گئی ہیں۔اوراب پورے ملک میں اس طرح کا قانون بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جس سے تبدیلی مذہب بند ہوسکے یا کم از کم اس میں کمی آسکے۔میرے خیال میں تبدیلی مذہب پر مطلقا پابندی عائد کرناممکن نہیں،البتہ اس کے پروسیس میں بہت سی شرائط لگا کر اس میں رکاوٹ کھڑی کی جاسکتی ہے،لیکن جو سعید روحیں حق سے آشنا ہوجاتی ہیں اور جنہیں اپنی اخروی نجات کی فکرلاحق ہوجاتی ہے،ان کو کوئی حق سے نہیں روک سکتا۔

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں　　میرے خیال کو بیڑی نہیں پنہا سکتے

کیا عرب میں اس کی آزادی تھی، کیا مصر کی فرعونی سلطنت نے اس کی اجازت دے رکھی تھی؟ نہیں۔لیکن ایسے ہی مقامات پر اسلام زیادہ تیز رفتاری سے پھیلا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ تبدیلی مذہب سے ماحول خراب ہوتا ہے اور سماج میں خطرناک مسائل جنم لیتے ہیں،تو یہ سراسر غلط پروپگنڈہ ہے۔حق قبول کرنے سے ماحول خراب نہیں بلکہ بہتر ہوتا ہے اور اس طرح مسائل جنم نہیں لیتے بلکہ ختم ہوتے ہیں۔کیا قبول حق کرنے والے ماحول خراب کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔قبول حق کرنے والے تو اپنی سابقہ اخلاقی وسماجی اور معاشرتی برائیوں کو ترک کرکے اور بھلائیوں اور نیکیوں کو اختیار کرکے ماحول کو سدھارنے اور خوشگوار بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔درحقیقت ماحول تو وہ لوگ خراب کرتے ہیں اور مسائل بھی وہی پیدا کرتے ہیں جو اس حق اور سچائی پر غور کرنے کے بجائے آنکھ بند کرکے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔انسان کس خاندان میں پیدا ہوتا ہے،اس میں کسی کا دخل نہیں لیکن اس کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ شعوری طور پر یہ فیصلہ کرسکے کہ اسے کون سا طریقہ زندگی اختیار کرنا ہے، کس مذہب میں اس کے مسائل کا حل اور قلبی وروحانی سکون کا سامان، نیز اخروی کامیابی کی ضمانت ہے۔

ملک میں اس وقت دعوت دین کے مختلف طریقے رائج ہیں،نوجوانوں کے درمیان بحث ومباحثہ کا رجحان بڑھ رہا ہے،آپ کس اسلوب کو زیادہ مناسب سمجھتے ہیں؟

دعوت دین کے طریقے کیا ہوں اس کے لیے کوئی متعین بات طے نہیں کی جاسکتی۔قرآن وحدیث کی روشنی میں اور حالات کے مطابق اس کے طریقے متعین کیے جاسکتے ہیں۔ بحث ومباحثہ کا طریقہ ماضی میں بھی رائج رہا ہے اور آج بھی رائج ہے۔قرآن نے ”وجادلھم بالتی ھی احسن “(ان کے ساتھ اس طریقے سے بحث ومباحثہ کرو جو بہترین ہو) کہہ کر اس طریقہ کی راہیں متعین کردی ہیں۔ بحث ومباحثہ میں بھی ایک داعی کے اندر دل سوزی، محبت اور انسانیت دوستی پائی جائے۔مخالف کو شکست

دینے، اس کے خلاف تالیاں پیٹنے یا نعرے بازی وہنگامہ آرائی کے بجائے اس کو سمجھانے اور سیدھے راستے پر لانے کی محبت ودل سوزی کے ساتھ کوشش کی جائے۔

یہاں یہ بات بھی سامنے رہے کہ بحث ومباحثے کو اپنا معمول نہ بنایا جائے۔ صحیح طریقہ یہی ہے کہ ایسا ماحول تیار کیا جائے جس میں آدمی غور وفکر کر سکے، اور اپنے لیے سنجیدگی سے کوئی صحیح راستہ پسند کر سکے۔

دعوت دین کے سلسلے میں آپ کے اہم تجربات جو ہمارے ساتھ شیئر کرنا پسند کریں گے؟

جہاں تک دعوت دین کے سلسلہ میں اہم تجربات کی بات ہے، وہ نہایت حوصلہ افزا اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ٹوٹی پھوٹی دعوتی سرگرمیوں کے نتیجے میں بے شمار لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوئی ہیں۔ بہت سارے لوگ مرد وخواتین دین رحمت اسلام کے قریب آئے ہیں اور انہوں نے اسلامی تعلیمات کو اپنی زندگی میں داخل کیا ہے۔ ان سعید روحوں میں جج، وکلاء، پروفیسرس، ڈاکٹرس، تاجر نیز سماج کے ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں۔ ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، اس بارے میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

میری دو کتابیں دعوتی تجربات حصہ اول دوم (ناشر مدھر سندیش سنگم) میں اس سلسلے کے بہت سے واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ اس بارے میں یہاں بس اتنا عرض کروں گا کہ انسانوں سے محبت، ان کی نجات کے لیے قلبی تڑپ اور ان کے تئیں اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنا، قول سے زیادہ اپنے عمل سے اسلام کی دعوت دینا ان شاء اللہ شاندار نتائج کا موجب ہوگا۔ میرا ماننا یہ ہے کہ انسان پیاسا ہے، مگر اسے معلوم نہیں کہ اس کی اس پیاس کو بجھانے کے لیے 'آب حیات' کہاں ملے گا۔ لیکن جب کبھی اس کے سامنے یہ آب حیات آجاتا ہے تو وہ اس پر ایسے ٹوٹ پڑتا ہے جیسے کوئی پیاسا پرندہ پانی سے بھرے برتن پر۔

آپ اس موقع پر کیا خاص پیغام دینا پسند کریں گے؟

اوپر جو باتیں عرض کی گئی ہیں ان میں ہم سب کے لیے بہت سے پیغامات موجود ہیں، تاہم چند باتیں مزید عرض کی جارہی ہیں:

یہ بات سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہئے کہ ہمارا نصب العین قرآن وسنت کے عین مطابق ہے۔ اگر اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے کماحقہ جدوجہد نہ کی جائے تو پھر اس کی حیثیت ایک مردہ عبادت سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس لیے اپنا یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ہمیں ہر وقت بیدار رہنا ہے، نیز اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا خود اندازہ لگا کر انہیں اللہ کے کام کے لیے وقف کرنا ہے۔ مسلم نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے لیے بہت سی طاقتیں سرگرم ہیں، لہذا ہمیں ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

اپنی صلاحیتوں کو بارآور بنانے اوران سے خوداپنے کواور پورے سماج اور ملک کو فیضیاب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری سوچ مثبت اور تعمیری ہو، اور یہ تبھی ممکن ہے جب ہم ہر حال میں خدا کے شکر گزار ہوں۔ ہمیں انتہاپسندی اور تشدد کے رویے سے مکمل پرہیز کرنا چاہیئے اور صبر وتحمل کو اپنا شیوہ بنا کر اپنے مقصد کی طرف گامزن رہنا چاہیئے۔ دین پسند مسلم نوجوانوں کو ایک اہم بات یہ یاد رکھنی چاہیئے کہ ان کا مقصد زندگی تو یقیناً نہایت اعلی اور ارفع ہو، لیکن اسے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد اور کوشش زمین سے شروع کرنی چاہیئے۔ زمینی حقائق کو نظرانداز کرکے تمناؤں اور خیالوں کی اونچی اڑان بھرنا اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے۔ اگر کوئی ہمیں صالح انقلاب کا شارٹ کٹ راستہ دکھاتا ہے تو ہمیں کبھی بھی اس کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیئے۔ بلا لحاظ مذہب وملت لوگوں کے مسائل کو سمجھنا اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرنا، لوگوں اور سماج کی آگے بڑھ کر خدمت کرنا، اور انہیں اپنے قول وعمل سے دین حق سے واقف کرانا یہی اقامت دین اور صالح انقلاب کا پہلا زینہ ہے اور یہی انبیائی طریقہ بھی رہا ہے۔ ہمیں اپنے ملک اور سماج سے محبت ہونی چاہیئے اور اس کو ہر طرح کے نقصان سے بچانے کی فکر ہونی چاہیئے۔ ہمیں سماج سے لینے کے بجائے اسے کچھ دینے کی فکر کرنی چاہیئے، کیونکہ ہمارے سماج کو جس چیز کی واقعی ضرورت ہے وہ صرف آپ کے پاس ہے ؎

یہ بھی تو سوچیئے کبھی تنہائی میں ذرا　　دنیا سے ہم نے کیا لیا، دنیا کو کیا دیا

ہمارے نوجوانوں کو حالات پر باریکی کے ساتھ نظر رکھنی چاہیئے۔ اسلام کے خلاف پھیلائی جارہی بے بنیاد باتوں اور سازشوں سے باخبر رہنا چاہیئے، اور اس کے ازالے کے لیے بروقت پیش رفت کرنی چاہیئے۔ جدید ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال ہونا چاہیئے، لیکن ہمارا ہر قدم اور ہر کام اسلامی تعلیمات کے مطابق اور داعیانہ کردار سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔

آخر میں ایک ضروری بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو کسی بھی حالت میں مایوسی کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دینا ہے اور علم واعلی اخلاق سے لیس ہو کر حکمت ودانائی اور صبر وتحمل کے ساتھ ناموافق حالات کو بدلنے کے لیے اپنے آپ کو تن من دھن سے اللہ کے لیے وقف کردینا ہے۔ اگر ہم ایسا کرسکے تو پھر ان شاء اللہ رب العالمین کی طرف سے ہمارے لیے یہ بشارت ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْن۔ (سورہ العنکبوت:۶۹)

''اور جو لوگ ہمارے مشن کو پورا کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر جدوجہد کریں گے، ہم ان کے لیے اپنی راہیں کھول دیں گے، بیشک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اپنے کام بہتر سے بہتر طریقے سے انجام دیتے ہیں''۔

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۲۳)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ای میل:mohiuddin.ghazi@gmail.com

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر ہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہو سکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لئے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

----

(۱۱۱) علقة اور مضغة کا ترجمہ

قرآن مجید میں علق کا لفظ ایک بار اور علقۃ کا لفظ متعدد بار آیا ہے، دونوں کا مطلب ایک ہے، اور وہ ہے جما ہوا خون، راغب اصفہانی لکھتے ہیں: والـعَلَقُ: الدّم الجامد ومنه: العَلَقَةُ التی یکون منها الـولد .الـمفـردات. علقہ کی اردو تعبیر کے لیے مترجمین نے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں، جیسے، جنین، لوتھڑا، خون کا لوتھڑا، خون کی پھٹک، خون کی پھٹکی، خون کا تھکا۔

علقہ کے لیے جنین کا لفظ کسی طرح مناسب نہیں ہے، کیونکہ جنین کا عمومی اطلاق عربی میں بھی اور اردو میں بھی پیٹ کے بچے پر ہوتا ہے، خواہ وہ کسی بھی مرحلے میں ہو، جبکہ اردو میں وہ مضغہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، راغب اصفہانی کے الفاظ میں، "والـجـنیـن: الـولـد مـادام فی بطن أمـه". المفردات. اردو کی مستند لغت فرہنگ آصفیہ میں ہے: ''جنین: مضغہ، لوتھڑا''۔

علقہ کے لیے لوتھڑا بھی مناسب لفظ نہیں ہے، کیونکہ اردو میں لوتھڑا گوشت کے لیے استعمال ہوتا ہے، جمے ہوئے خون کے لیے استعمال نہیں ہوتا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں ہے: لوتھڑا: گوشت کا بڑا ٹکڑا جس میں ہڈی نہ ہو، مضغہ، گوشت پارہ، پارچہ، مچا۔

خون کا لوتھڑا بھی مناسب لفظ نہیں ہے، کیونکہ لوتھڑا گوشت کا ہوتا ہے، جمے ہوئے خون کو لوتھڑا نہیں کہتے۔

خون کی پھٹک یا پھٹکی سے علقہ کا مفہوم کسی قدر ادا ہوجاتا ہے، فرہنگ آصفیہ میں ہے: ''پھٹکی: گٹھلی، گرہ، گانٹھ، کسی خشک چیز کے گھولنے سے جو گٹھلیاں پڑ جاتی ہیں''۔

بعض مترجمین نے جما ہوا خون ترجمہ کیا ہے، یہ لفظی ترجمہ ہے۔

مضغۃ کا لفظ گوشت کی بوٹی کے لیے آتا ہے، زمخشری لکھتے ہیں: والمضغة: اللحمةالصغیرة قدر مایمضغ. مضغۃ کا ترجمہ بعض لوگوں نے لوتھڑا کیا ہے اور بعض لوگوں نے بوٹی کیا ہے، لوتھڑا چونکہ گوشت کے بڑے ٹکڑے کو کہتے ہیں، اس لحاظ سے بوٹی کا لفظ زیادہ مناسب ہے۔ غرض یہ کہ دونوں الفاظ کے لئے ایسے اردو متبادل کی جستجو ہونی چاہئے جو ان الفاظ کا واقعی مفہوم ادا کرتے ہوں۔ اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل ترجموں کا جائزہ مفید ہوگا:

(۱) یَا أَیُّهَا النَّاسُ إِن کُنتُمْ فِی رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاکُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَکُمْ۔ (الحج:۵)

''لوگو! اگر تم کو دھوکہ ہوا ہے جی اٹھنے میں تو ہم نے تم کو بنایا مٹی سے پھر بوند سے پھر پھٹکی سے پھر بوٹی سے نقشہ بنے اور بن نقشہ بنے، اس واسطے کہ تم کو کھول کر سنا دیں'' (شاہ عبدالقادر)

''لوگو، اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں'' (سید مودودی)

''اے لوگو، اگر تمہیں قیامت کے دن جینے میں کچھ شک ہو تو یہ غور کرو کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے پھر پانی کی بوند سے پھر خون کی پھٹک سے پھر گوشت کی بوٹی سے نقشہ بنی اور بے بنی، تا کہ ہم تمہارے لیے اپنی نشانیاں ظاہر فرمائیں'' (احمد رضا خان)

''اے لوگو، اگر تم دوبارہ جی اٹھنے کے باب میں شبہ میں ہو تو دیکھو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر منی کے ایک قطرے سے، پھر ایک جنین سے، پھر ایک لوتھڑے سے، کوئی کامل ہوتا ہے اور کوئی ناقص، ایسا ہم نے اس لیے کیا تا کہ تم پر (اپنی قدرت وحکمت) اچھی طرح واضح کریں'' (امین احسن اصلاحی، اس ترجمہ میں علقہ کے لیے جنین کا لفظ مناسب نہیں ہے)

اس آیت میں لنبين لكم کا مفہوم عام طور سے یہ لیا گیا ہے کہ اللہ تعالی تخلیق کے ان مراحل سے یا ان کے تذکرے سے اپنی قدرت وحکمت کو واضح کرتا ہے۔ مولانا امانت اللہ اصلاحی کے مطابق اس کا اصل مفہوم تو یہ ہے کہ جنین مخلقۃ اور غیر مخلقۃ اس لیے ہوتا ہے تا کہ انسانوں پر حقیقت واضح ہو جائے، یعنی غیر مخلقہ جنین کے ساقط ہو جانے سے انسانوں پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ تخلیق کے کتنے مرحلوں سے جنین کا گزر ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا تو اس وقت کے انسانوں کو ان مراحل کا علم بھی نہیں ہوتا۔ البتہ اس کا ضمنی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے یہ واضح ہو جائے کہ ان سب مراحل میں اللہ کی قدرت کام کر رہی ہوتی ہے، اس کے بغیر یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، ہر مرحلہ میں اللہ کی مشیت کارفرما ہوتی ہے۔

اس آیت میں مترجمین نے عام طور سے (من) کا ترجمہ ''سے'' کیا ہے، مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ ترجمہ اس طرح ہونا چاہئے: ''پھر وہ پھٹکی بنا، پھر وہ بوٹی بنا''۔

(۲) ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔ (المؤمنون:۱۴)

''پھر بنائی اس بوند سے پھٹکی پھر بنائی اس پھٹکی سے بوٹی پھر بنائی اس بوٹی سے ہڈیاں، پھر پہنایا ان ہڈیوں پر گوشت پھر اٹھا کھڑا کیا اس کو ایک نئی صورت میں۔ (شاہ عبدالقادر)

پھر ہم نے پانی کی بوند کو ایک جنین کی شکل دی، پھر جنین کو گوشت کا لوتھڑا بنایا، پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں، پھر ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا، پھر اس کو ایک بالکل ہی مختلف مخلوق میں متشکل کر دیا'' (امین احسن اصلاحی، اس ترجمہ میں علقہ کا ترجمہ جنین کیا گیا ہے، جو درست نہیں ہے، مزید یہ کہ فخلقنا المضغة عظاما کا ترجمہ کیا گیا پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ الفاظ کی رو سے بھی اور امر واقع کے لحاظ سے بھی ترجمہ ہوگا پھر بوٹی کو ہڈیاں بنایا۔)

''پھر نطفہ کو ہم نے جما ہوا خون بنا دیا، پھر اس خون کے لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا کر دیا۔ پھر گوشت کے ٹکڑے کو ہڈیاں بنا دیں، پھر ہڈیوں کو ہم نے گوشت پہنا دیا، پھر دوسری بناوٹ میں اس کو پیدا کر دیا'' (محمد جونا گڑھی)

''پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ (سید مودودی)

پھر ہم نے اس پانی کی بوند کو خون کی پھٹک کیا پھر خون کی پھٹک کو گوشت کی بوٹی پھر گوشت کی بوٹی کو ہڈیاں پھر ان ہڈیوں پر گوشت پہنایا، پھر اسے اور صورت میں اٹھان دی'' (احمد رضا خان)

''پھر نطفے کا لوتھڑا بنایا۔ پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت (پوست) چڑھایا۔ پھر اس کو نئی صورت میں بنا دیا'' (فتح محمد جالندھری)

(۳) هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ۔ (غافر: ٦٧)

''وہی ہے جس نے بنایا تم کو خاک سے پھر پانی کی بوند سے پھر لہو کی پھٹکی سے'' (شاہ عبدالقادر)

''وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا مٹی سے، پھر نطفے سے، پھر خون کی ایک پھٹکی سے'' (امین احسن اصلاحی)

''وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے'' (سید مودودی)

''وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے بنایا پھر پانی کی بوند سے پھر خون کی پھٹک سے'' (احمد رضا خان)

اس آیت میں مترجمین نے عام طور سے تینوں جگہ (من) کا ترجمہ ''سے'' کیا ہے، مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ تیسرے من کا ترجمہ اس طرح ہونا چاہئے: ''پھر وہ پھٹکی بنا''۔

(۴) ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً۔ (القیامۃ: ٣٨)

''پھر تھا لہو کی پھٹکی'' (شاہ عبدالقادر)
''پھر وہ بنا خون کی ایک پھٹکی'' (امین احسن اصلاحی)
''پھر خون کی پھٹک ہوا'' (احمد رضا خان)
''پھر وہ ایک لوتھڑا بنا'' (سید مودودی)
(۵) خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ (العلق:۲)
''بنایا آدمی لہو کی پھٹکی سے'' (شاہ عبدالقادر)
''جس نے پیدا کیا انسان کو خون کے تھکے سے'' (امین احسن اصلاحی)
''جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا'' (اشرف علی تھانوی)

(۱۱۲) تاب علی کا مفہوم

تاب کے معنی لوٹنے کے ہوتے ہیں، قرآن مجید میں بندوں کے لیے تاب کا فعل الی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے اللہ کی طرف رجوع اور انابت کرنا، اس وسیع مفہوم میں توبہ کرنا اور معافی مانگنا بھی شامل ہے، لیکن لفظ کا اصل مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔

اللہ کے لیے تاب کا فعل علی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے مہربان ہونا نظر کرم فرمانا۔ اس وسیع مفہوم میں توبہ کی توفیق دینا اور توبہ قبول کرلینا اور معاف کردینا بھی شامل ہے، لیکن اصل مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔

فیروزآبادی کے الفاظ میں: وتابَ اللہ علیه: وفَّقَه للتَّوبةِ، أو رجَعَ به من التَّشدِيد الى التَّخفيفِ، أو رَجَعَ عليه بِفَضْلِهِ وقبوله۔ القاموس المحيط (ص:62) سورہ توبہ میں بیان ہوا ہے: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا۔ اس سے اچھی طرح تاب علی کا مفہوم واضح ہوتا ہے، یعنی اس لفظ کے مفہوم میں نہ صرف توبہ قبول کرنا بلکہ مہربانی کرنا اور توبہ کی توفیق دینا بھی آتا ہے۔

مختلف تراجم قرآن کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تاب علی کے مفہوم کی یہ وسعت عام طور سے مترجمین کے سامنے بھی رہی ہے اور بعض نے اکثر جگہ اور بعض نے کچھ جگہوں پر لفظ کے اس مفہوم کو ادا بھی کیا ہے تاہم بعض ایسے مقامات جہاں معاف کرنے کے بجائے مہربان ہونا ہی مناسب ترجمہ ہوسکتا تھا، وہاں بعض مترجمین نے معاف کرنا ترجمہ کیا ہے، ایسے بعض مقامات کا ہم یہاں بطور مثال تذکرہ کریں گے:

(۱) عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَؤُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ۔ (المزمل:۲۰)

''اس نے جانا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے تو اس نے تم پر عنایت کی نظر کی، تو قرآن میں سے جتنا میسر ہو سکے پڑھ لیا کرو'' (امین احسن اصلاحی)

''اس نے معلوم کیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے تو اس نے تم پر مہربانی کی'' (فتح محمد جالندھری)

''اسے معلوم ہے کہ اے مسلمانو! تم سے رات کا شمار نہ ہو سکے گا تو اس نے اپنی مہر سے تم پر رجوع فرمائی'' (احمد رضا خان)

''اُسے معلوم ہے کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے، لہٰذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی'' (سید مودودی)

''اس نے جانا کہ تم اس کو پورا نہ کر سکو گے تو تم پر معافی بھیجی (شاہ عبدالقادر)

(۲) وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُواْ إِلَى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُواْ أَنفُسَكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ (البقرۃ:۵۴)

''اور جب کہا موسی نے اپنی قوم کو اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا یہ بچھڑا بنا لیکر، اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان، یہ بہتر ہے تم کو اپنے خالق کے پاس، پھر متوجہ ہوا تم پر برحق وہی ہے معاف کرنے والا مہربان'' (شاہ عبدالقادر)

(۳) وَحَسِبُواْ أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُواْ وَصَمُّواْ ثُمَّ تَابَ اللّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُواْ وَصَمُّواْ كَثِيرٌ مِّنْهُمْ وَاللّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ۔ (المائدۃ:۷۱)

''اور انھوں نے گمان کیا کہ کوئی پکڑ نہیں ہوگی، پس اندھے اور بہرے بن گئے، پھر اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی، پھر ان میں سے بہت سے اندھے بہرے بن گئے، اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں'' (امین احسن اصلاحی)

''اور خیال کرتے تھے کہ (اس سے ان پر) کوئی آفت نہیں آنے کی تو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے پھر خدا نے ان پر مہربانی فرمائی (لیکن) پھر ان میں سے بہت سے اندھے اور بہرے ہو گئے اور خدا ان کے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے'' (فتح محمد جالندھری)

''اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رونما نہ ہوگا، اس لیے اندھے اور بہرے بن گئے پھر اللہ نے اُنہیں معاف کیا تو اُن میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے اور بہرے بنتے چلے گئے اللہ اُن کی یہ سب حرکات دیکھتا رہا ہے'' (سید مودودی)

''اور اس گمان میں ہیں کہ کوئی سزا نہ ہوگی تو اندھے اور بہرے ہو گئے پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی پھر ان میں بہتیرے اندھے اور بہرے ہو گئے اور اللہ ان کے کام دیکھ رہا ہے'' (احمد رضا خان)

''اور سمجھ بیٹھے کہ کوئی پکڑ نہ ہوگی، پس اندھے بہرے بن بیٹھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی، اس کے بعد بھی ان میں سے اکثر اندھے بہرے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو بخوبی دیکھنے والا ہے'' (محمد جوناگڑھی)

(۴) لَقَد تَّابَ الله عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالأَنصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِن بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ۔ وَعَلَى الثَّلاَثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُواْ حَتَّى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّواْ أَن لاَّ مَلْجَأَ مِنَ اللّهِ إِلاَّ إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُواْ إِنَّ اللّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ (التوبۃ: ۱۱۷، ۱۱۸)

''اللہ نے معاف کر دیا نبیؐ کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ دیا اگر چہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے (مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبیؐ کا ساتھ ہی دیا تو) اللہ نے انہیں معاف کر دیا، بے شک اُس کا معاملہ اِن لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے۔ اور اُن تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جن کے معاملہ کو ملتوی کر دیا گیا تھا جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے، تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تا کہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں، یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے'' (سید مودودی، تاب علی کا ترجمہ دونوں طرح سے کیا ہے جبکہ دونوں جگہ مہربانی کرنے کا محل ہے)

''بیشک اللہ کی رحمتیں متوجہ ہوئیں ان غیب کی خبریں بتانے والے اور ان مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے مشکل کی گھڑی میں ان کا ساتھ دیا بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان میں کچھ لوگوں کے دل پھر جائیں پھر ان پر رحمت سے متوجہ ہوا بیشک وہ ان پر نہایت مہربان رحم والا ہے، اور ان تین پر جو موقوف رکھے گئے تھے یہاں تک کہ جب زمین اتنی وسیع ہو کر ان پر تنگ ہو گئی اور ہو اپنی جان سے تنگ آئے اور انہیں یقین ہوا کہ اللہ سے پناہ نہیں مگر اسی کے پاس، پھر ان کی توبہ قبول کی کہ تائب رہیں، بیشک اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے'' (احمد رضا خان، تاب علی کا ترجمہ دونوں طرح سے کیا ہے، جبکہ دونوں جگہ مہربانی کرنے کا محل ہے)

''اللہ نے نبی اور مہاجرین وانصار پر رحمت کی نظر کی جنھوں نے نبی کا ساتھ تنگی کے وقت میں دیا، بعد اس کے کہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے، پھر اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی۔ بے شک وہ ان پر نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور ان تینوں پر بھی رحمت کی نگاہ کی جن کا معاملہ اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین، اپنی وسعتوں کے باوجود، ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں ضیق میں پڑ گئیں اور انھوں نے اندازہ کر لیا کہ خدا سے، خدا کے سوا، کہیں مفر نہیں۔ پھر اللہ نے ان پر عنایت کی نظر کی تا کہ وہ توبہ کریں۔ بے شک اللہ ہی ہے جو توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے'' (امین احسن اصلاحی، یہاں دونوں جگہ تاب علی کا ترجمہ مناسب ہے)

''اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے حال پر توجہ فرمائی اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی جنہوں نے ایسی تنگی کے وقت پیغمبر کا ساتھ دیا، اس کے بعد کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں کچھ تزلزل ہو چلا تھا۔ پھر اللہ نے ان کے حال پر توجہ فرمائی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان سب پر بہت ہی شفیق مہربان ہے۔ اور تین شخصوں کے حال پر بھی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین باوجود اپنی فراخی کے ان پر تنگ ہونے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ اسی کی طرف رجوع کیا جائے پھر ان کے حال پر توجہ فرمائی تا کہ وہ آئندہ بھی توبہ کر سکیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا بڑا رحم والا ہے'' (محمد جوناگڑھی)

(۵) أَأَشْفَقْتُمْ أَن تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَاتٍ فَإِذْ لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ۔ (المجادلة: ۱۳)

''کیا تم اس بات سے اندیشہ ناک ہوئے کہ اپنی رازدارانہ باتوں سے پہلے صدقے پیش کرو۔ پس جب تم نے یہ نہیں کیا اور اللہ نے تم پر رحم فرمایا تو نماز کا اہتمام کرو اور زکوۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو'' (امین احسن اصلاحی)

''کیا تم ڈر گئے اس بات سے کہ تخلیہ میں گفتگو کرنے سے پہلے تمہیں صدقات دینے ہوں گے؟ اچھا، اگر تم ایسا نہ کرو اور اللہ نے تم کو اس سے معاف کر دیا تو نماز قائم کرتے رہو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو'' (سید مودودی، اس ترجمہ میں توجہ طلب بات یہ ہے کہ یہاں محل مہربانی کرنے کا ہے نہ کہ معاف کرنے کا، اور ''اس سے معاف کر دیا'' تو اس لفظ کے مفہوم میں آ ہی نہیں سکتا، کیونکہ کسی کو معاف کرنے کے لئے تو تاب علی آتا ہے، لیکن کسی کو کسی کام سے معاف کرنے کے لئے یہ لفظ نہیں آتا ہے، اسی طرح (اذلم تفعلوا کا ترجمہ ماضی کا ہونا چاہئے، نہ کہ مستقبل کا جیسا کہ یہاں

کیا گیا ہے، دوسرے مترجمین نے اس کا ترجمہ ماضی کا کیا ہے اور وہی درست ہے)

''کیا تم اس سے کہ پیغمبر کے کان میں کوئی بات کہنے سے پہلے خیرات دیا کرو ڈر گئے؟ پھر جب تم نے (ایسا) نہ کیا اور خدا نے تمہیں معاف کر دیا تو نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہو اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے رہو۔'' (فتح محمد جالندھری)

''کیا تم اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ نکالنے سے ڈر گئے؟ پس جب تم نے یہ نہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی تمہیں معاف فرما دیا تو اب (بخوبی) نمازوں کو قائم رکھو زکوٰۃ دیتے رہا کرو اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی تابعداری کرتے رہو۔'' (محمد جوناگڑھی)

(۶) يُرِيدُ اللّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔ وَاللّهُ يُرِيدُ أَن يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَن تَمِيلُواْ مَيْلاً عَظِيماً۔ (النساء:۲۶و۲۷)

''اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم پر (اپنی آیتیں) واضح کر دے اور تمہیں ان لوگوں کے طریقے کی ہدایت بخشے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، اور تم پر رحمت کی نگاہ کرے۔ اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم پر رحمت کی نگاہ کرے اور وہ لوگ جو اپنی شہوات کی پیروی کر رہے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ تم پر راہ حق سے بالکل ہی بھٹک کر رہ جاؤ'' (امین احسن اصلاحی)

''اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اُن طریقوں کو واضح کرے اور اُنہی طریقوں پر تمہیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحاء کرتے تھے وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے، اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔ ہاں، اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے مگر جو لوگ خود اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ'' (سید مودودی)

''خدا چاہتا ہے کہ (اپنی آیتیں) تم سے کھول کھول کر بیان فرمائے اور تم کو اگلے لوگوں کے طریقے بتائے اور تم پر مہربانی کرے اور خدا جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔ اور خدا تو چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی کرے اور جو لوگ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم سیدھے راستے سے بھٹک کر دور جا پڑو'' (فتح محمد جالندھری)

''اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے خوب کھول کر بیان کرے اور تمہیں تم سے پہلے کے (نیک) لوگوں کی راہ پر چلائے اور تمہاری توبہ قبول کرے، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور

اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے اور جو لوگ خواہشات کے پیرو ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم اس سے بہت دور ہٹ جاؤ'' (محمد جونا گڑھی)

(۷) لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُوراً رَّحِيماً۔ (الاحزاب:۷۳)

''اِس بارِ امانت کو اٹھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں، اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مَردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے، اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے'' (سید مودودی)

''(یہ اس لیے) کہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں عورتوں اور مشرک مردوں عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں عورتوں کی توبہ قبول فرمائے، اور اللہ تعالیٰ بڑا ہی بخشنے والا اور مہربان ہے'' (محمد جونا گڑھی)

''تاکہ اللہ منافقین ومنافقات اور مشرکین ومشرکات کو سزا دے اور مومنین ومومنات کو اپنی رحمت سے نوازے۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے'' (امین احسن اصلاحی)

''تاکہ خدا منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور خدا مومن مردوں اور مومن عورتوں پر مہربانی کرے۔ اور خدا تو بخشنے والا مہربان ہے'' (فتح محمد جالندھری)

(۸) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ (البقرۃ:۱۲۸)

''اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری ذریت میں سے تو اپنی ایک فرمانبردار امت اٹھا اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما، بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے'' (امین احسن اصلاحی)

''اور ہم کو معاف کر تو ہی ہے اصل معاف کرنے والا مہربان'' (شاہ عبدالقادر)

''اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے'' (سید مودودی)

''اور ہماری توبہ قبول فرما، تو توبہ قبول فرمانے والا اور رحم وکرم کرنے والا ہے'' (محمد جونا گڑھی)

''اور ہمارے حال پر (رحم کے ساتھ) توجہ فرما۔ بے شک تو توجہ فرمانے والا مہربان ہے'' (فتح محمد جالندھری)

''اور ہمارے حال پر توجہ رکھئے اور فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے مہربانی کرنے والے''(اشرف علی تھانوی)

(۱۱۳) توبة من الله

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَن يَقْتُلَ مُؤْمِناً إِلاَّ خَطَئاً وَمَن قَتَلَ مُؤْمِناً خَطَئاً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلاَّ أَن يَصَّدَّقُواْ فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مْؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةً فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّهِ وَكَانَ اللّهُ عَلِيماً حَكِيماً۔(النساء:۹۲)

اس آیت میں(تَوْبَةً مِّنَ اللّهِ) کا ترجمہ مختلف طرح سے کیا گیا ہے:

''یہ اللہ کی طرف سے ٹھہرائی ہوئی توبہ ہے''(امین احسن اصلاحی)

''اللہ تعالی سے بخشوانے کے لئے''(محمد جوناگڑھی)

''یہ اللہ کے یہاں اس کی توبہ ہے''(احمد رضا خان)

''یہ اس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے''(سید مودودی)

ان تمام ترجموں کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ توبہ کو تاب الی یعنی توبہ کرنے کے معنی میں لیا گیا ہے، اور اسی وجہ سے لفظ من کے مفہوم کی ادائیگی میں بھی مترجمین کو دشواری پیش آئی ہے، مولانا امانت اللہ اصلاحی کی رائے کے مطابق یہاں توبہ تاب علی یعنی مہربانی کرنے کے مفہوم میں ہے، ترجمہ ہوگا''یہ اللہ کی طرف سے مہربانی ہے'' جملہ کی تفصیل اس طرح ہوگی:(تَوْبَة مِّنَ اللّهِ علی عباده) مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے قتل خطا کے سلسلے میں جو کچھ رہنمائی فرمائی ہے وہ اللہ کی طرف سے بندوں پر اس کی مہربانی ہے۔اس طرح لفظ من کے مفہوم کی ادائیگی احسن طریقے سے ہوجاتی ہے، اور جملہ کا مفہوم بھی پوری آیت سے بخوبی ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔

افادات جلیل احسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۱)

ظفر احمد الاثری، لندن، ای میل:asarizafar@hotmail.com

دور اول میں قرآن مجید پر تدبر اور تفکر

قرآن مجید کے نزول کا دور، وہ سنہرا دور جس میں نبی کریمؐ نے قرآن پر تدبر اور تفکر کو اپنا شیوہ بنالیا تھا۔ تدبر قرآن میں جو مقام آپؐ کو حاصل تھا وہ کسی کو حاصل نہیں تھا اور تلاوت قرآن سے جو رقت آپؐ پر طاری ہوتی تھی وہ رقت کسی پر طاری نہیں ہوتی تھی۔ عوف بن مالکؓ کہتے ہیں:''آپ کسی ایسی آیت سے گزرتے جو رحمت والی ہوتی تو وہاں آپ رُک جاتے اور اللہ تعالی سے اس کی رحمت کے خواستگار ہوتے اور اگر کسی ایسی آیت کی تلاوت کرتے جس میں عذاب کا تذکرہ ہوتا تو آپ اس سے پناہ مانگتے''(۲) اور حضورؐ جب نماز پڑھتے تھے تو اس قدر روتے تھے کہ رونے کی وجہ سے سینے سے ہانڈی کے پکنے جیسی آواز سنائی دیتی تھی۔ عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، آپ کے سینے سے رونے کی وجہ سے ہانڈی کے پکنے جیسی آواز آرہی تھی''(۳)۔

حضور اکرمؐ کا قرآن سے شغف کا یہ حال تھا کہ قرآن آپ پر نازل ہو رہا تھا، لیکن پھر بھی عبداللہ بن مسعودؓ سے کہتے کہ قرآن پڑھ کر سناؤ۔ عبداللہ بن مسعود جواب دیتے، اے اللہ کے رسولؐ میں آپ کو قرآن سناؤں، قرآن تو آپ پر اترا ہے۔ آپؐ فرماتے قرآن میں دوسروں سے سننا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے سورہ نساء پڑھی اور جب اس آیت پر پہنچا''فكيف اذا جئنا من كل امة ۔۔۔''، تو میں نے آپ کی طرف دیکھا، آپ کی آنکھیں اشک بار تھیں۔''(۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن پر تدبر اور تفکر

قرآن پڑھ کر اس کے معانی کی تہہ تک پہنچ جاتے اور اس کا اثر آپ کی زندگی میں فوراً نمایاں طور پر نظر آتا۔ قرآن پر تدبر اور تفکر آپ کا مشغلہ تھا اور آپ اس عمل سے ایک لمحہ کے غافل نہیں ہوتے تھے۔

اور یہی حال آپ کے جانباز ساتھیوں کا تھا جو ہر لمحہ آپ کے ساتھ گزارتے تھے اور قرآن کے معانی کی تہہ تک پہنچ کر اس سے لذت اندوز ہوتے تھے۔

عبداللہ بن عمرؓ کبار صحابہ میں سے تھے، قرآن پاک کے چشمہ سے بھرپور طریقے سے سیراب ہوتے تھے، جب یہ آیت پڑھی: ''أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ۔۔۔۔'' (سورہ حدید:۱۶) تو آپؓ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔'' (۵)

''اسی طرح جب سورہ مطففین پڑھنا شروع کیا اور ''يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِين'' تک پہنچے تو رونے لگے اور گر پڑے اور اس کے بعد قرأت جاری نہ رکھ سکے'' (۶)

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ'' قرآن کی تلاوت کا حق یہ ہے کہ آیتوں کے حلال وحرام کو سمجھ لیا جائے اور اس کے کلام میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کی جائے اور کوئی ایسی تاویل نہ کی جائے جو خود قرآن کو مطلوب نہ ہو'' (۷)

وہ کہتے ہیں ہم میں سے کوئی بھی جب تک دس آیتوں کے معانی سمجھ نہ لیتا اور اس پر عمل نہ کر لیتا اس وقت تک کسی دوسری آیت کی طرف نہ بڑھتا۔ (۸)

ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے رسولؐ سے قرآن کے الفاظ اور اس کے معانی سیکھے۔ (۹)

ابن قیمؒ کہتے ہیں صحابہؓ کے پاس قرآن کے علاوہ دوسری اور کوئی کتاب نہیں تھی، قرآن ہی کو پڑھتے اور سمجھتے تھے، قرآن کے علاوہ تفقہ کے لیے کوئی اور دوسری کتاب نہیں تھی، یہی ان کا سرمایہ تھا۔ جہاں بھی بیٹھتے تھے، قرآن کا مذاکرہ کرتے تھے، قرآن ہی ان کے پاس تھا اور اسی کو سینہ سے چمٹائے ہوئے تھے، اسی کو یاد کرتے، اسی کو سمجھتے اور تفقہ حاصل کرتے۔ (صواعق مرسلہ) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن سے کس قدر ان کے یہاں لگاؤ پایا جاتا تھا۔

صحابہ کرامؓ کا معمول تھا کہ اگر کوئی آیت سمجھ میں نہ آتی تو فوراً رسول کی طرف رجوع کرتے اور مطلب معلوم کرتے تھے۔

ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت اتری ''الَّذِينَ آمَنُواْ وَلَمْ يَلْبِسُواْ إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُوْلَـئِكَ لَهُمُ الأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ'' (سورہ انعام:۸۲) تو مسلمانوں پر بہت شاق گزرا، انھوں نے کہا ہم میں سے کون ہے جو اپنے اوپر ظلم نہیں کرتا، رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ایسی بات نہیں ہے بلکہ اس سے مراد صرف شرک ہے اور آپؐ نے فرمایا: کیا تم نے لقمان علیہ السلام کی یہ بات نہیں سنی، ''يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ'' (لقمان:۱۳) (۱۰)

قرآن مجید اور سنت رسولؐ کے ذریعہ قرآن کی تفسیر

یہ حقیقت ہے کہ قرآن کا نزول مختلف اوقات میں ہوا اور مضامین میں تکرار ہے، کہیں ایجاز ہے اور کہیں اطناب، جو چیز ایک جگہ مختصراً بیان ہوئی ہے دوسری جگہ تفصیلاً۔ کہیں عام ہے اور کہیں خاص۔ اس لیے قرآن کی تفسیر کے لیے ضروری ہے کہ ایک موضوع سے متعلق آیتوں کو جمع کر کے ان کا مطلب اخذ کیا جائے، اسی طرح مفصل آیات سے مجمل آیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ قرآن کے قاری کو قرآن پر تفکر کرنا ہوگا اور قرآن کے الفاظ پر غور کرنا ہوگا، اور قرآن پر تدبر اور تفکر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن سے غیر متعلق معلومات سے دور رہا جائے، قرآن کے تدبر اور تفکر کے وقت قرآن سے متعلق کوئی ایسی معلومات مل جائے جو موافق ہو اسے قبول کر لیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔(۱۱)

امام تیمیہ بہترین تفسیر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ صحیح ترین تفسیر قرآن کے ذریعہ ہے اور وہ اس طرح ہے کہ جہاں کسی آیت میں اجمال ہے اس کی تفسیر اور تفصیل قرآن میں دوسری جگہ کر دی گئی ہے اور اگر کہیں اختصار ہے تو اس اختصار کو دوسری جگہ کھول کر بیان کر دیا گیا ہے، اگر ایسا نہ ہو اور کسی آیت کی تفسیر میں مشکل پیش آ رہی ہو تو سنت رسولؐ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس لیے کہ سنت رسول قرآن کی تشریح اور تفسیر بیان کرتی ہے۔(۱۲)

قرآن کی تفسیر اور اس کا نشو و نما

قرآن کا نزول پورے بائیس سال کے عرصہ میں ہوا، قرآن عربی زبان میں نازل ہوا اور اللہ کی سنت رہی ہے کہ رسول اپنی قوم کی زبان میں بات کرتا ہے اور اسی زبان میں مخاطب ہوتا ہے۔ اللہ تعالی قرآن میں فرماتا ہے: وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه۔(سورہ ابراہیم:۴)(۱۳)(اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہ اپنی قوم کی زبان بولتا تھا) انـا أنزلناه قرآنا عربيا۔(سورہ یوسف:۱)(ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا)۔(۱۴)

صحابہ کرام حسب مراتب قرآن کے معانی سمجھتے تھے، اور اگر سمجھنے میں دشواری پیش آتی تو رسول اللہؐ کی طرف رجوع کرتے۔ اور آیت کی تفسیر معلوم کرتے، حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا الکوثر جنت میں ایک نہر ہے جو اللہ نے مجھے عطا کی ہے۔

آیاتِ احکام نازل ہوتیں تو ان کی تشریح کے لیے صحابہ رسول اکرمؐ کی طرف رجوع کرتے، اگر قرآن کی تفسیر معلوم کرنی ہوتی تو اپنے فہم کے مطابق اجتہاد کرتے، اس لیے کہ وہ عربی زبان کی بلاغتوں

سے اچھی طرح واقف تھے۔صحابہ کی ایک جماعت ہے جس کی تفسیر کی کتابیں موجود ہیں۔صحابہ کے بعد قرآن کی تفسیر تابعین نے بھی کی۔اوران کا طریقہ بھی وہی تھا جوصحابہ کا تھا۔پہلے رسول کی سنت دیکھتے اگر وہاں کوئی چیز نہیں ملتی تو صحابہ کی رائے معلوم کرتے ،اور وہاں بھی کوئی چیز نہیں ملتی تو اپنے فہم وتدبر سے قرآن کی تفسیر بیان کرتے اور معانی اخذ کرتے ،اس لیے کہ اس وقت تک تفسیر کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔

جس طرح صحابہ کے زمانہ میں قرآن کی تفسیر کرنے والے صحابہ موجود تھے اسی طرح تابعین کے دور میں ایسے نامور مفسر تابعین موجود تھے جوصحابہ کی تفسیر اور آراء سے مستفید ہوتے تھے۔پھر خود بھی اجتہاد اور تدبر وتفکر سے اس میں مہارت پیدا کرتے تھے۔تفاسیر کی کتابوں میں صحابہ اور تابعین کے اقوال موجود ہیں۔

اسلامی حکومتوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور صحابہ کرام اور تابعین کرام دوسرے مفتوحہ علاقوں میں منتقل ہوگئے تو مکہ،مدینہ اورعراق میں قرآن کی تفسیر کی بڑی درسگاہیں قائم ہوگئیں۔

تفسیر کا عام طریقہ یہ تھا کہ وہ لوگوں سے سنتے اور بیان کرتے تھے۔پھر جب اہل کتاب اسلام میں داخل ہوئے تو ان سے تابعین نے اسرائیلی روایات بھی بیان کرنا شروع کردیا۔

قرآن کی تفسیر لکھنے کا آغاز بنی امیہ کے آخری دور اور عہدعباسی کے شروع کے دور میں ہوا۔ حدیث نبوی کی تدوین کے موقع پر محدثین کے یہاں تفسیر کا ایک مستقل باب ہوتا۔جس میں مستقل سورتوں یا آیتوں کی تفسیر نہ ہوتی بلکہ قرآن سے متعلق روایتیں جو نبی کریمؐ،صحابہ کرامؓ اور تابعین سے مروی تھیں انہیں جمع کردیا گیا۔اس طرح تفسیری مواد لکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔پھر کچھ عرصہ کے بعد مستقل تفسیریں لکھی جانے لگیں۔قرآن کے شروع سے لے کر آخر تک تمام سورتوں کی تفسیر مرتب ہونے لگی۔جیسے جیسے علوم وفنون مدون ہوئے ، مختلف علوم کا پھیلاؤ ہوا،علم کلام،علوم عربیہ،علوم فلسفہ کی ترویج ہوئی اوران میں ترقی ہوئی،اسی طرح تفسیر میں بھی وسعت آتی گئی،ساتھ ہی ان علوم کے اثرات بھی تفسیر کا حصہ بنتے گئے۔

ہندوستان میں قرآن پر تدبر اور قرآن کی تدریس

صحابہ کرامؓ قرآن مجید کے معانی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سمجھتے رہے اور ایک دوسرے سے روایت کرتے رہے اور یہ سلسلہ تابعین تک چلتا رہا۔پھر محدثین نے ان روایتوں کو اپنی احادیث کی کتابوں میں جمع کردیا۔بعد میں یہ سب مرویات کتابوں کی شکل میں تدوین ہوئیں۔تین سوہجری اور چار

سو ہجری تک تفاسیر اسناد کے ساتھ لکھنے کا رواج رہا۔ اس کے بعد اسناد کے بغیر تفاسیر لکھنے رواج ہو گیا تو صحیح اور ضعیف اور اسرائیلی روایات کا داخلہ شروع ہو گیا۔ ظاہر ہے قرآن پر تدبر اور تفکر کا دروازہ بند ہوتا چلا گیا اور براہ راست قرآن کو سمجھنے کے بجائے ان تفاسیر پر انحصار ہو گیا جو رطب و یابس کی مرکب تھیں۔ یہی نہیں تفاسیر میں علوم عقلیہ اور علوم فلسفہ کو بھی جگہ ملتی گئی اور اس کے ساتھ ہی فقہی مسائل کی تفسیریں بھی لکھی جانے لگیں چنانچہ قرآن پر براہ راست تدبر اور تفکر کی راہیں بند ہوتی چلی گئیں۔

ہندوستان کی سرزمین میں ابتدا سے قرآن کی تشریح اور اس کا مطالعہ مروّج رہا، البتہ عہد اکبری میں تبدیلی کا رجحان پیدا ہوا۔ ''عہد اکبری (۱۵۵۶۔تا۱۶۰۶) سے قبل زمخشری کی ''الکشاف'' کا مطالعہ اور تشریح مروج رہی ہے مگر اس دور میں انوار التنزیل (بیضاوی) کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے بڑی تعداد میں حواشی لکھے گئے، اسے تفسیری نصاب مدارس کا لازمی جزو بنالیا گیا اور قرآن کریم کے ساتھ اسے حفظ کیا جانے لگا۔ اسی عہد میں قرآن فہمی اور مطالعہ قرآن کا انہماک رکھنے والے علماء کا بڑا حلقہ بھی وجود میں آیا۔۔۔۔علماء نے قرآن کے محض تصنیفی و تالیفی پہلو پر ہی توجہ نہیں دی بلکہ انفرادی مجالس اور مذاکرات میں تفسیری مسائل پر بحث اور قدیم تفاسیر پر نقد و جرح اور تشریح و توضیح کا سلسلہ جاری رکھا، اسی عہد کے حوالے سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مطالعہ قرآن سے متعلق تمام مساعی میں معقولات کا اثر نمایاں اور عربی کا غلبہ واضح دکھائی دیتا ہے''۔(۱۵) لیکن ہندوستان میں قرآن فہمی کا سہرا مجدّد وقت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۲۔۱۷۶۲ء) کے سر جاتا ہے۔ علم تفسیر و حدیث کے حوالہ سے آپ پہلے فرد ہیں جنھوں نے ہندوستان میں ان علوم کو رواج دیا۔ آپ نے طویل عرصہ کے بعد باقاعدہ ترجمہ قرآن فارسی زبان میں پیش کیا، اس کے مقدمہ میں قرآن فہمی کے کچھ اصول بھی درج کیے۔ یہ قرآن فہمی کا ذوق انہیں اپنے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیمؒ سے ملا، آپ کی عادت تھی کہ اپنے اصحاب کے حلقہ میں روزانہ قرآن مجید کے دو یا تین رکوع پڑھتے اور پھر ان پر انتہائی تدبر اور غور و فکر کرتے۔(۱۶)

ہندوستان میں قرآن مجید کی تدریس کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا، مدارس میں تفاسیر کی مختلف کتابیں داخل نصاب رہیں اور سبقاً سبقاً وہ تفاسیر کلاسوں میں جاری ہیں، اور اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ لیکن ماضی قریب میں اس سے ہٹ کر قرآن کے درس کا براہ راست آغاز علامہ شبلیؒ (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۱۴ء) اور امام حمیدالدین فراہیؒ (۱۸۶۳ء۔۱۹۳۰ء) کے استاذ مولانا فیض الحسن سہارنپوری (۱۸۱۶ء۔ ۱۸۸۷ء) نے کیا۔ اورنٹیل کالج کی تعطیل کے زمانہ میں اپنے وطن آتے تو وہاں بھی درس و تدریس کا

سلسلہ جاری رہتا۔ سہارنپور کی جامع مسجد میں قرآن مجید کی تفسیر کا درس دیا کرتے تھے۔ مفتی عبداللہ ٹونکی (۱۷) مولانا عبدالعلی، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی (۱۸) سہارنپور کے اس درس میں شریک ہوتے تھے۔(۱۹)

مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ کے دو عظیم الشان کارنامے ہیں۔ پہلا کارنامہ یہ ہے عربی ادب میں مروجہ ادب کو جو عباسی اور اموی دور کے شعراء عربی ادب پر آ کر رک جاتا تھا، آپ ان سرحدوں کو توڑ کر جاہلی ادب اور جاہلی شعراء کی طرف متوجہ ہوئے، اور اس میں دسترس حاصل کی۔ اس میں آپ ید طولی رکھتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ خاکِ ہند میں اتنا بڑا امام ادب صدیوں کے بعد پیدا ہوا۔ ان کا دوسرا کارنامہ یہ تھا عام نہج سے ہٹ کر قرآن کے درس کا سلسلہ شروع کیا، جس سے متعلق مولانا سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) ''حیات شبلی'' میں لکھتے ہیں:'' مولانا فیض الحسن صاحب کا سب سے بڑا فیض قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی نکتہ شناسی تھی، مولانا فیض الحسن صاحب اسی اصول سے قرآن پاک کا بامحاورہ اردو ترجمہ اپنے خاص طالب علموں کو پڑھاتے اور فصاحت و بلاغت کے نکتے بتاتے تھے، علامہ شبلی مرحوم میں یہ ذوق اخیر تک رہا، ندوہ کے جلسہ کی تقریر میں جو چھپی ہوئی ہے، ادھورے اشارے ہیں، حیدرآباد میں اس موضوع پر پوری تقریر فرمائی، دارالعلوم ندوہ میں آ کر چند طالب علموں کو جن میں یہ خاکسار بھی تھا قرآن پاک کے اعجازی نکتوں پر متعدد درس دیئے۔''(۲۰) اسی کا اثر تھا کہ علامہ شبلی نے ندوہ میں قرآن پاک کا درس بھی سبقاً سبقاً داخل نصاب کیا اور ۱۹۰۶ء میں قرآن پاک کے عالمانہ درس کے لیے خود اپنا وقت نکالا اور درس شروع کیا۔ اس میں مدرسہ کے اکثر طلبہ اور بعض مدرسین بھی شریک ہوئے، اس میں ہر مسئلہ پر پوری پوری بحث ہوتی تھی''۔ اس سے کئی باتوں پر روشنی پڑتی ہے، مولانا فیض الحسن صرف عربی ہی نہیں پڑھاتے تھے بلکہ اس کے ساتھ قرآن کا درس دیتے تھے اور عام روایت سے ہٹ کر اس کے اعجاز اور بلاغت کی بھرپور تشریح کرتے تھے اور طلبہ کے لیے قرآن فہمی کا راستہ ہموار کرتے تھے، اس میں طلبہ اور وقت کی عظیم ہستیاں شرکت کرتی تھیں، ظاہر ہے مولانا حمیدالدین فراہیؒ نے عربی ادب کا درس لینے کے ساتھ ساتھ ان سے قرآن کا بھی درس لیا اور اس کے اسرار و رموز سیکھے، چنانچہ ان کے یہاں قرآن فہمی اور تدبر کی راہ یہیں سے استوار ہوئی۔

مولانا فیض الحسن کے فکر اور تدبر کے اس منہج کو مولانا فراہیؒ نے بلندیوں تک پہنچایا اور فکر و تدبر کی ایک بالکل نئی راہ نکالی۔ مولانا فراہی نے قرآن فہمی کے لیے ایک نیا راستہ اختیار کیا اور وہ تھا براہ راست قرآن پر تدبر اور تفکر کا راستہ۔ اس طرح کہ قرآن کی تدریس کے وقت کسی تفسیر کو سامنے رکھے بغیر براہ

راست قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے اور قرآن کی حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔مولانا فراہی نے اس منہج فکر و تدبر کے منظّم اصول وضع کیے اور مربوط انداز میں پوری امت اسلامیہ کے سامنے اس فکر کو پیش کیا، جسے ''نظم قرآن'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔مولانا فراہیؒ نے قرآن کے نظم پر ایک مستقل کتاب لکھ کر قرآن کے اندر نظم کو ثابت کیا، اور بتلایا کہ ہر سورہ کا ایک عمود یا موضوع ہوتا ہے اور اس سورہ کی تمام آیتیں بڑی ہی حکمتوں پر مبنی مناسبت اور ترتیب سے اس موضوع یا عمود سے متعلق ہوتی ہیں۔مولانا فراہی کے نزدیک نظم قرآن میں دین کی بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔انہوں نے نظم، ربط اور مناسبت جو آیتوں اور سورتوں میں موجود ہے اس پر غور وفکر اور تدبر کر کے دین وشریعت کی حکمتیں واضح کی ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ تدبر اور تفکر نظم قرآن کو جاننے اور سمجھنے والے اہم ذرائع میں سے ہے۔(۲۱)

مولانا فراہیؒ نے تدریس قرآن کے اس مروجہ طریقہ کو بدل کر ایسا زبردست کارنامہ انجام دیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔صدیوں سے مدارس میں قرآن کی تفسیر کے رائج طرز پر کاری ضرب لگائی۔ اس طریقۂ تعلیم اور قرآن پر تدبر اور تفکر کے منہج کو علامہ شبلیؒ نے صرف سراہا، بلکہ ندوۃ العلماء میں مولانا فراہی کو اس نہج پر طلبہ اور اساتذہ کو درس دینے کے لیے بلایا بھی، تاکہ قرآن کا درس تحقیق کے ساتھ ہو اور سرسری نہ ہو۔مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں: ''اس عظیم المرتبت کام کو انجام دینے کے لیے اپنے بھائی حمید الدین فراہی کو قرآن پڑھانے کے لیے بلایا، چنانچہ دو سال تک اپنی تعطیل میں آکر قرآن پاک کا درس دیتے رہے۔(۲۲) یہ بات واضح ہے کہ جب یہ درس کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اس وقت تک امام حمید الدین فراہیؒ ''نظام القرآن'' کے کافی مباحث لکھ چکے تھے، اس لیے غالب گمان ہے کہ درس کا یہ اسلوب و انداز نظم قرآن کے تحت ہی چلتا ہوگا۔

اس فکر نے ایسی تحریک پیدا کی جو فہم قرآن اور تدبر قرآن کے راستہ میں سنگ میل ثابت ہوئی، اور تحقیق و تدبر کی راہ میں ایک زبردست مہمیز کا کام کر گئی۔مولانا فراہی نے ایسے طریقۂ تدریس کی ترویج کا کام کیا جس سے عربی زبان سکھانے کا راستہ جو نہایت مشکل تھا، وہ سائنٹفک اور سہل ترین ہو گیا، جبکہ اس سے قبل عربی قواعد سیکھنے میں سالہا سال لگتے تھے، اب وہ صرف ایک دو سال کی تعلیم سے ازبر ہو جاتے ہیں۔اس کے لیے انہوں نے اسباق النحو کے نام سے نحو وصرف کی دو کتابیں لکھیں، جن کی تعلیم کے بعد نحو وصرف کے سارے عقدے کھل جاتے ہیں۔مروجہ نحو وصرف کی ضخیم کتابوں پر یہ کتاب اس اعتبار سے حاوی، آسان اور سائنٹفک ہے کہ ایک سال پوری مشق کے ساتھ تعلیم کے بعد طالب علم پر عربی زبان کے حصول کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں، بشرطیکہ طالب علم عربی زبان سیکھنے کے لیے مخلص ہو۔۔

انہوں نے اس فکر کو قائم و دائم رکھنے کے لیے اپنی زندگی کے آخری ایام کو ایک ٹیم کی تیاری کے لیے مختص کر دیا۔ ۱۹۱۹ء میں دارالعلوم حیدرآباد کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن اعظم گڑھ آ گئے اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی خدمت میں لگ گئے۔ یہاں اساتذہ اور منتہی درجات کے طلبہ کو قرآن مجید کا درس دیتے اور ایک مشن کے تحت ایک ٹیم کی تیاری میں لگ گئے جو ان کے منہج کو اپنا سکے اور ان کے قرآن مجید پر تدبر و تفکر کے مشن کو جاری رکھ سکے۔ اس ٹیم میں ان کے دو عزیز شاگرد مولانا اختر احسن اصلاحیؒ (۳۲) اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ ''صاحب تدبر قرآن'' شامل تھے جو ہر اعتبار سے ممتاز تھے اور ان کے مشن کو اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے لیے تیار تھے۔ ان دونوں نے اپنے استاذ کی فکر کو اپنے اپنے محاذ پر رہتے ہوئے کافی بلندیوں تک پہنچایا۔ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ نے تعلیم و تربیت کے میدان میں ایک نسل تیار کی جس نے دنیائے اسلام کے ہر میدان میں اپنی علمیت کا لوہا منوایا، فکر و عمل اور علم و تحقیق کے میدان میں خوب خوب جوہر دکھلائے، چنانچہ فکر فراہی چہار دانگ عالم میں پھیلتی چلی گئی۔ ان خوشہ چینوں میں قرآن کا ایک عاشق مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کی صحبت میں رہ کر ایسا گو ہر بن کر نکلا جس نے کئی کئی نسلوں کو قرآن مجید کے سر چشمہ سے سیراب کرنے کا کام کیا، اور فکر فراہی کو اپنے سینے میں اس طرح محفوظ کر لیا کہ اس کے بغیر اسے چین نہ ہوتا تھا۔ یہ تھے مولانا جلیل احسن ندویؒ، جنہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام جامعۃ الفلاح میں گزارے اور قرآن مجید پر تدبر و تفکر کا وہ منہج اختیار کیا جو امام حمیدالدین فراہیؒ نے پیش کیا تھا۔ یہ منہج انہوں نے امام فراہیؒ کے خاص شاگرد مولانا اختر احسن اصلاحیؒ سے حاصل کیا تھا۔ چنانچہ مولانا جلیل احسن ندویؒ نے قرآن پر فکر و تدبر کے نتیجہ میں ایسے ان گنت اثرات ونقوش چھوڑے جو ان شاء اللہ ان کے لیے آخرت کا توشہ ہوں گے، اللہ تعالی انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، آمین۔

قرآن مجید سے لگاؤ ۔خود ان کی زبانی

مولانا جلیل احسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ فکر فراہی کے تربیت یافتہ تھے۔ مولانا کے اندر بچپن ہی سے قرآن سمجھنے کا شوق موجزن تھا اور اسی شوق وجستجو میں وہ مدرسۃ الاصلاح گئے تھے۔ مولانا اپنی تعلیم کے دوران قرآن مجید کے علوم سے واقفیت کے لیے مولانا حمیدالدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن اللہ کو یہ منظور نہ تھا، وہ لکھتے ہیں: ''تمنا تھی کہ جب اللہ مجھے استفادہ کے لائق بنائے گا تو استاذ امام فراہیؒ سے قرآن مجید میں استفادہ کی سعادت حاصل کروں گا، لیکن ''کافیہ'' کے درس میں بجنور سے شائع ہونے والا سہ روزہ مدینہ استاذ کے پاس پہنچا، اس میں مولانا فراہی کی

وفات کی خبر پڑھ کر فرمایا، ''لوتمہارے ضلع کا ایک نامور عالم قرآن چلا گیا''، یہ خبر سن کر میرا کیا حال ہوا اس کو اللہ کے سوا کون جان سکتا ہے۔ اس طرح میری زندگی کی پہلی تمنا ناکام ہوگئی۔'' (۲۴) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا، مولانا فراہیؒ کی فکر سے کتنا قریب تھے اور انہوں نے کس قدر ان کی فکر کو اپنے اندر سمویا ہوگا۔

قرآن سے بے پناہ عشق تھا۔ اس کے معانی اور مطالب میں غوطہ زن ہو جاتے تھے اور اس کے حصول میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ قرآن کا عقدہ سلجھانے میں کسی طرح کی پریشانی محسوس نہ کرتے اور جب تک آیتوں کے معانی نہ سمجھ لیتے اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے۔ قرآن مجید کا کوئی بھی درس بغیر مطالعہ اور تیاری کے نہیں پڑھاتے تھے۔ درس کے مالہ اور ماعلیہ کا مطالعہ کر لیتے تھے اس کے بعد ہی طلبہ کے سامنے تفسیر کرتے تھے۔

عام طور سے تدریس کا منہج اس طرح ہوتا:

۱۔ سورتوں کا عموداوران کی توضیح

۲۔ نحوی ترکیبیں اوران کی توضیح، ان تراکیب کی روشنی میں معنی کے فرق کو واضح کرتے۔

۳۔ نظائر قرآن کو بیان کرتے۔

۴۔ اختلاف آراء کو بتلاتے اور تاویل کے فرق کی وضاحت کرتے۔

۵۔ احادیث کی روشنی میں آیات کی تشریح کرتے۔

۶۔ معاجم سے استفادہ اوراس کی روشنی میں معانی کی وضاحت کرتے۔

۷۔ قرآن کے اندر خطاب کی وضاحت کرتے اور اس کی روشنی میں مفسرین کا اختلاف بیان کرتے۔

قرآن کے درس کے دوران، مختلف مفسرین کے ترجمے سامنے رکھتے، الفاظ کی تحقیق کے وقت مختلف معاجم کی طرف رجوع کرتے، مشکل آیات حل کرنے اور سمجھانے کا فن انہیں حاصل تھا، اور بعض اوقات مشکل آیت ہوتی تو اس پر خصوصی توجہ دیتے اور اس آیت کے بارے میں خصوصی نوٹ لکھواتے تاکہ طالب علم کے ذہن سے صحیح مفہوم نکل نہ جائے۔

الفاظ کی تحقیق اور معانی طے کرنے بعد آیت کا مفہوم بیان کرتے اور تفسیر کے فرق کو واضح کرتے اور مفسرین کی آراء کی وضاحت کرتے جن میں شاہ رفیع الدینؒ، (۱۷۴۹ء-۱۸۱۷ء) شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) امام حمید الدین فراہیؒ (۱۸۶۳ء-۱۹۳۰ء)، مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، (۱۹۰۴ء-۱۹۵۸ء)،

مولانا امین احسن اصلاحیؒ (۱۹۰۴ء۔۱۹۹۷ء)، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۹ء)، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ (۱۹۱٦ء۔۱۹۹۸ء)، مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۸٦۳ء۔۱۹۴۳ء) کے علاوہ اور بھی مفسرین اور مترجمین شامل ہوتے تھے۔

قرآن ایک منظم کتاب ہے

مولانا اس نظریہ کے قائل تھے کہ قرآن ایک منظّم کتاب ہے اور اس میں ایک منطقی ترتیب ہے اور اسی ترتیب کو سامنے رکھ کر قرآن کو سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''قرآن ایک منظّم کتاب (۲۵) ہے اور اس کے لیے بہت دلائل ہیں، ان میں سے سب سے پہلی دلیل اس کی موجودہ ترتیب ہے (۲٦)، اگر یہ کتاب غیر منظّم اور بے ربط ٹکڑوں کا مجموعہ ہوتی تو سب سے عمدہ ترتیب ترتیب نزولی ہوتی، لیکن سب جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، یا پھر ترتیب مقداری ہوتی کہ ہر ایک حصہ کو یکساں طور پر بانٹ دیا جاتا نہ کوئی چھوٹا ہوتا اور نہ کوئی بڑا، جب نزولی اور مقداری ترتیب نہیں ہے تو کیا ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے، تو ظاہر ہے ترتیب موضوعی ہوگی جسے ہم اصول تفسیر میں ترتیب عمومی کہتے ہیں۔

چنانچہ قرآن ایک منظّم کتاب ہے اور اس کے سات حصے ہیں۔

سورتوں کے گروپ اور ان کا عمود

فاتحہ تا مائدہ	اس میں پہلی سورہ مکی اور بقیہ مدنی
انعام تا توبہ	اس میں پہلی دونوں مکی اور آخری دونوں مدنی
یونس تا نور	اس میں چودہ سورتیں مکی اور صرف سورہ نور مدنی
فرقان تا احزاب	اس میں آٹھ سورتیں مکی اور آخری مدنی
سبا تا حجرات	تیرہ مکی اور آخری تین مدنی
ق تا تحریم	اس میں سات مکی اور دس مدنی
ملک تا ناس	اس میں مکی اور مدنی ملی جلی ہیں

جس طرح ہر سورہ کا عمود ہوتا ہے اسی طرح ہر گروپ کا الگ الگ عمود ہوتا ہے۔

پہلے گروپ کا عمود قانون وشریعت ہے۔ (فاتحہ تا انعام)

دوسرے گروپ کا عمود ملت ابراہیمی اور اس کے اصول فروع ہیں۔ (انعام تا توبہ)

تیسرے گروپ کا عمود حق و باطل کی کشمکش اور سنت الٰہیہ کا بیان ہے۔ (یونس تا نور)

چوتھے گروپ کا عمود نبوت اور رسالت اور اس کے خصائص و امتیازات ہیں۔ (فرقان تا احزاب)
پانچویں گروپ کا عمود توحید اور اس کے لوازمات اور اس کے مقتضیات ہیں۔ (سبا تا حجرات)
چھٹے گروپ کا عمود بعث، حشر و نشر اور اس کے متعلقات ہیں۔ (ق تا تحریم)
ساتواں گروپ منذرات کا گروپ ہے جو جھنجھوڑنے والا اور جگانے والا ہے اور جنھوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں سے ابتدائے دعوت میں آگ لگا دی تھی اور آخرت کی پیاس بجھانے کا کام کیا تھا۔ (ملک تا ناس)

توضیح مزید:

(۱) ہر گروپ کی مدنی سورتوں کی حیثیت شاخ اور مکی سورتوں کی حیثیت اصل کی (جڑ) ہے۔
(۲) ہر سورہ اپنا جوڑا رکھتی ہے، سورہ فاتحہ اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ وہ پورے قرآن کا دیباچہ ہے۔
(۳) بعض سورتیں ضمیمہ ہیں مثلاً سورہ حجرات کہ وہ دراصل سورہ فتح کی آخری آیت کے تکملہ کے طور پر آئی ہے۔
(۴) ہر گروپ میں دعوت اسلامی کی ابتدا اور انتہا کا بیان ہے۔
(۵) سب سے پہلے جو سورتیں نازل ہوئیں وہ آخر میں ہیں۔
(۶) قانون و شریعت بالکل شروع میں رکھ دیا گیا ہے اس لیے کہ نبی کی بعثت کے مقاصد میں یہ بھی ہے کہ وہ ایک امت تیار کر کے جائے۔ اب یہ صاحب شریعت و قانون امت ہوئی تو جس طرح کسی عمارت کی بنیاد زمین کے اندر سے لی جاتی ہے اور اس کا بالائی حصہ جو تکمیلی حیثیت رکھتا ہے وہ سامنے ہوتا ہے، بالکل اسی طرح اِس دین کی عمارت کا نقشہ ہے اور یہ بھی حکمت شاید ملحوظ ہے کہ یہ تیار شدہ امت جب کتاب ہدایت کھولے تو سب سے پہلے اس کے سامنے جو بات آئے وہ یہ کہ وہ کیا خصائص ہیں جنہیں زندہ رکھنا ہے اور وہ کیا رویہ ہے جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کو معزول کر کے اس امت کو حامل کتاب بنایا گیا ہے۔

مولانا اپنے اس تجزیاتی نوٹ میں دو اہم نکتوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں:

پہلا نکتہ یہ کہ قرآن میں جتنے گروپ ہیں ان سب میں دعوت اسلامی کا ذکر ہوتا ہے، اسی سے ابتدا ہوتی ہے اور اسی پر انتہا۔

دوسرا نکتہ یہ کہ اس دین کی اصل چیز وہ قانون و شریعت ہے جسے یہود نے پامال کر دیا تھا اور اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اپنے اسی رویے اور اپنی مسلسل نافرمانیوں کی وجہ سے وہ

قیادت اور سیادت کے منصب سے معزول کر دیے گئے، اور ان کی جگہ اس امت کو قیادت اور سیادت کا منصب دے دیا گیا، اور کہا گیا کہ تم اس قانون وشریعت کے ساتھ وہ حرکت نہ کرنا جو یہود نے کی، ورنہ تمہارے ساتھ وہی سنت اپنائی جائے گی جو یہود کے ساتھ اپنائی گئی۔

سورتوں کا تجزیہ

مولانا درس کے دوران سورتوں کا تجزیہ پیش کرتے تھے، تاکہ آیتوں کے مضامین کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ سورہ بقرہ کا تجزیہ یوں کرتے تھے:

(۱۔۱۳) تمہید

(۱۴۔۱۵۲) یہود کو اس کتاب اور اس نبی پر ایمان لانے کی دعوت اور ان کی شرارتوں کے سبب ان کی معزولی کا اعلان اور امت مسلمہ کا ان کی جگہ انتخاب۔

(۱۵۳۔۲۴۲) احکام وشرائع کا بیان جس میں آیت (۱۵۳۔۱۷۷) تک اس باب کی تمہید ہے جس میں دین کے اصول اور کلیات پر گفتگو کی گئی ہے، تاکہ خالص قانونی حصہ پر اس کی روح کے ساتھ عمل ہو سکے۔

(۲۴۳۔۲۸۳) میں حکمت کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۲۸۴۔۲۸۶) سورہ کے خاتمہ کی آیتیں ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ پہلا ٹکڑا تلاوت آیات کا باب ہے، یعنی از ابتدا تا ۱۵۲/اور ۱۵۳/سے لے کر ۲۴۲/والا حصہ احکام وشرائع یعنی تعلیم الکتاب پر مشتمل ہے اور ۲۴۳ تا ۲۸۳/حکمت کا باب ہے اور یہی نبی کی بعثت کا مقصد ہے۔

ایک سورہ کا دوسری سورہ کے ساتھ نظم

وہ سورہ آل عمران کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

''یہ سورہ (آل عمران) احد کے بعد نازل ہوئی، اس کا عمود 'اسلام' ہے۔ اس میں اہل کتاب پر زور دیا گیا ہے کہ اس نبی کی اطاعت قبول کرو۔ جس طرح سورہ بقرہ میں اہل کتاب یعنی یہود کے مزاعم کی تردید کی گئی ہے اور ایمان کی دعوت دی گئی ہے اسی طرح اس سورہ میں یہود کے مزاعم بتا کر نبی کی اطاعت کی دعوت دی گئی ہے۔ بہت سی جہتوں سے دونوں سورہ مشترک ہیں، بعض چیزیں اس میں مجمل ہیں اور بعض مفصل ہیں، یعنی جس چیز کو سورہ بقرہ میں مجمل بیان کیا گیا ہے اسے سورہ آل عمران میں تفصیلا بیان کیا گیا ہے، اسی طرح اس میں جو بات تفصیلاً بیان کی گئی ہے، وہ سورہ آل عمران میں مجمل بیان کی گئی ہے۔

اسی اشتراک کی وجہ سے اس کو سورہ بقرہ کے بعد رکھا گیا ہے۔ یہ بھی مشترک بات ہے کہ دونوں سورتوں میں خطاب یہود سے ہے۔

سورہ نساء کے بارے میں فرماتے ہیں:

''سورہ آل عمران میں نظری اسلام کی بات پیش کی گئی ہے۔ اس سورہ میں عملی اسلام پیش کیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں کو ایسے اعمال کی تلقین کی گئی ہے جس سے ان کی اجتماعی زندگی پروان چڑھے۔ گویا یہ سورہ سورہ آل عمران کا تکملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ آل عمران کا خاتمہ تقوی پر ہے اور سورہ نساء کی ابتداء تقوی سے ہوئی ہے''۔

سورتوں کا پس منظر اور شان نزول

مولانا جلیل احسن ندویؒ کے درس کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے سورہ کا تجزیہ کرتے، پھر حالات اور واقعات کو سامنے رکھ کر سورہ کے نزول کی تاریخ کو طے کرتے، وہ اس طرح کہ سورہ کی آیتوں کو سامنے رکھ متعین کرتے کہ سورہ کب نازل ہوئی۔ اس سے اس کے نزول کی تاریخ کا علم ہو جاتا تھا اور اس کا پس منظر بھی سمجھ میں آجاتا تھا۔ سورہ توبہ کے بارے میں کہتے ہیں:

(۱۔۲۲) یہ آیتیں فتح مکہ سے چار ماہ قبل نازل ہوئیں۔

(۲۳۔۳۷) ۸ہجری کے اخیر یا شروع میں نازل ہوئیں۔

(۳۸۔۸۰) تبوک کی تیاری کے ایام میں نازل ہوئیں۔

(۸۱۔۱۱۶) تبوک جانے کے بعد اور واپسی سے پہلے، اس میں منافقین کا تذکرہ بھی ہے۔

(۱۱۷۔۱۲۹) مدینہ پہنچنے کے بعد تمام کارروائیوں پر عمل پیرا ہونے کے بعد یعنی پچاس دنوں کے بعد۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ سورہ کن حالات میں نازل ہوئی اور اس وقت کیا صورتحال تھی، اس کے تاریخی پس منظر کو پیش کرنے بعد سورہ کے نزول کی تاریخ کو متعین کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''پہلی آیت کا لفظ بتاتا ہے کہ ان مشرکین نے معاہدہ میں خیانت کی ہے جس کی وجہ سے سورہ انفال کی آیت ۵۸ر پر عمل کرتے ہوئے یہ معاہدہ ان کے منہ پر مارا جارہا ہے۔ اگر انھوں نے کھلم کھلا معاہدہ شکنی کی ہوتی تو ''براۃ'' کی کیا ضرورت تھی، اور ''المشرکون'' سے مراد وہی مشرکین مکہ ہیں جن سے مسجد حرام کے پاس حدیبیہ میں صلح ہوئی تھی۔ یہ معاہدہ دس سال کے لیے تھا اور اس کی دفعات میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ مشرکین قبائل کو اس بات کی آزادی ہوگی کہ وہ مدنی محمدی کیمپ میں شامل ہوں یا مکی

ابوسفیان کیمپ میں۔اس دفعہ کی رو سے قبیلہ خزاعہ، نبوضمرہ، بنو کنانہ محمدی کیمپ میں شامل ہوگئے جو غالباً خزاعہ کی ترغیب پر شامل ہوئے، یہ وہ قبیلہ ہے جو باوجود مشرک ہونے کے سب سے زیادہ نبیؐ پر اعتماد کرتا تھا۔اس پر کی لیڈر بہت مشتعل ہوئے، یہ ہماری ناک کے نیچے رہتے ہوئے گویا مدینہ کے لیے جاسوسی کا کام انجام دیں گے، اسی لیے قریشی لیڈروں نے بنی قضاعہ، بنی بکر (۲۷) کو بھڑکایا کہ تم لوگ خزاعہ سے انتقام لو، ہم ہتھیار وغیرہ کی سپلائی کرتے ہیں اور ہمارے براہ راست خزاعہ پر حملہ کرنے میں سیاسی اور جنگی مصالح مانع ہیں، چنانچہ انھوں نے رات کی تاریکی میں سوتے ہوئے لوگوں پر حملہ کیا اور بلا امتیاز مسلم اور کافر سب کو مارنا شروع کردیا،عورتوں کی چھاتیاں کاٹ ڈالیں، ان کے ساتھ بدکاری کی اور جن لوگوں نے حرم میں پناہ لی انھیں بھی نہیں چھوڑا، اس صورت کو دیکھ کر ایک خزاعی (۲۸) شخص اپنی تیز رفتار سانڈھنی پر مدینہ کی طرف روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر ساری روئداد سنادی، اس پر نبیؐ نے فرمایا کہ لا نصرت ان لم انصر ۔ابوسفیان کو پتہ چلا تو تجدید معاہدہ کی غرض سے بھاگے ہوئے مدینہ آئے لیکن ناکام واپس لوٹے۔پس ہمارے نزدیک سورہ توبہ کی آیت ا ر سے لے کر آیت ۲۲ ر تک کم از کم فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔اس میں مشرکین کی خیانت کا ذکر ہے، معاہدہ صاف صاف توڑے جانے کا ذکر ہے، ان کو چار مہینے کی مہلت دی گئی تاکہ وہ اپنے بارے میں دو باتوں میں ایک بات قبول کرلیں، یا تو اسلام لاکر بھائی بن جائیں یا مسلمانوں کی تلواروں کا لقمہ بن کر رہ جائیں، تیسری کوئی راہ نہیں، نیز آئندہ ان لوگوں سے کوئی معاہدہ نہیں کیا جائے گا، البتہ جن قبائل نے معاہدہ میں خیانت کی مہم میں حصہ نہیں لیا ہے ان کے بارے میں مسلمان معاہدہ کے پابند ہوں گے۔اخیر (سورہ) میں مختلف طریقوں سے ان کے خلاف لڑنے پر ابھارا گیا ہے، بتایا گیا ہے کہ اب کعبہ کی تولیت ان کے ہاتھ سے چھین لو' (۲۹)

اس طرح اس واقعہ سے سورہ توبہ کے نزول پر واضح روشنی پڑتی ہے اور سبب نزول کے بارے میں علم ہوتا ہے۔یہی منہج مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔سورہ نساء کے زمانہ نزول کے بارے میں لکھتے ہیں: ''یہ سورہ (نساء) متعدد خطبوں پر مشتمل ہے جو غالباً ۳ ر ہجری کے اواخر سے لے کر ۴ ر ہجری کے اواخر یا ۵ ر ہجری کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے ہیں۔اگرچہ یہ تعیین کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلہ تقریر میں نازل ہوئی تھیں اور ان کا ٹھیک زمانہ نزول کیا ہے، لیکن بعض احکام اور واقعات کی طرف بعض اشارے ایسے ہیں جن کے نزول کی تاریخیں ہمیں روایات سے معلوم ہو جاتی ہیں۔اس لیے ان کی مدد سے ہم ان مختلف تقریروں کی ایک سرسری سی حد بندی کر سکتے ہیں جن میں یہ احکام اور یہ اشارے واقع ہوئے ہیں۔'' (۳۰)

یہود اور مشرکین سے خطاب اور دعوت اسلامی

قرآن مجید نے جہاں اہل مکہ سے خطاب کیا ہے، وہیں ان کے باطل خیالات اور جاہلی تصورات پر بھی ضرب لگائی ہے اور ان کی ریشہ دوانیوں کو نشانہ بنا کر ان کے مزاعم پر سخت تنقید کی ہے۔ ان کا یہ مشغلہ بن چکا تھا کہ طرح طرح کے اعتراضات اور پروپیگنڈے کر کے مومنین کی صفوں میں تشکیک پیدا کر دیں اور دعوت اسلامی کی بیخ کنی کر دیں، ان کی تدبیروں اور چالوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا نبی ہے جو حرام کو حلال قرار دے رہا ہے۔ سورہ حج کی ۵۱/تا ۵۵/آیتوں میں اس کا جواب دیا گیا ہے، وہ آیتیں یہ ہیں:

وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْ آيَاتِنَا مُعَاجِزِيْنَ أُوْلَئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيْمِ۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْ أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِيْ الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ وَاللَّهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِيْ الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ۔ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ آمَنُوا إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ۔

مولانا ان آیتوں کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

''سورہ الحج آیت ۵۱/میں اسلام کے خلاف اور اس کے احکام اور قوانین کے خلاف مخالفین حق جن میں یہود بھی شامل ہیں، سب کی ریشہ دوانیوں اور مخالفانہ سرگرمیوں اور شک وشبہ والی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا کہ یہ لوگ اسلامی احکام ومسائل کے سلسلے میں القاء شبہات کرتے ہیں مثلاً اونٹ کی قربانی اور اس کے حلال ہونے کا مسئلہ جسے یہود نے اپنی تحریفات کے ذریعہ حرام قرار دے دیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ جتنے رسول اور نبی آئے ان سب کے یہاں اونٹ کی قربانی اور اس کا گوشت حرام ہے۔ یہ کیسا پیغمبر ہے جو اونٹ کی قربانی کو افضل ترین قربانی قرار دیتا ہے اور گوشت خوری جائز کر رکھی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اللہ کا پیغمبر نہیں ہے ورنہ نبیوں کی راہ سے نہیں ہٹتا۔ اسی طرح بہت سے مسائل واحکام سے مشرکین ناراض ہیں، نصاری ناراض ہیں تو اسی طرح کے اعتراضات کا جواب سورہ حج کی آیت (۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵) میں دے دیا گیا۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے جتنے صاحب کتاب اور مجدد کتاب پیغمبر بھیجے انھوں نے صحیح دین حق پہنچایا اور لوگوں کو اصلاح وتقوی کی راہ پر لگایا۔ یہاں تک کہ خیر وبرکت کا وہ معاشرہ بنا اور جب وہ

دنیا سے رخصت ہوا تو اس کی آخری تمنا یہی تھی کہ لوگ دین حق پر قائم رہیں اور کتاب اپنی شکل میں موجود رہے، لیکن پھر ایسا ہوا کہ کتاب الٰہی کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور لوگوں پر حب عاجلہ اور اتباع شہوات مستولی ہو گیا اور انھوں نے اپنی کتاب میں تحریف کر ڈالی۔ لفظ کی بھی تحریف، عبارت کی بھی تحریف اور عملی تحریف بھی۔ پھر اللہ نے دوسرے نبی کو بھیجا، اور اس نے اپنی تعلیمات کو صحیح اور صاف صورت میں پیش کیا، اسی قاعدے کے تحت محمدؐ کی بعثت ہوئی، اور نئی کتاب آئی اور یہ نئی کتاب شیطانی تحریفات کو مٹا کر صحیح احکام دیتی ہے، اور ایسے ڈھنگ سے دیتی ہے کہ اس میں کوئی رخنہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ جو لوگ شیطانی تحریفات سے چمٹے ہوئے تھے ان کے لیے یہ احکام فتنہ بن گئے، اب وہ سب مل کر اسلام کے خلاف طوفان اٹھا رہے ہیں، یہود بھی، مشرکین بھی، منافقین بھی، البتہ اہل کتاب میں سے صالحین کو ان احکام کی وجہ سے بڑا اطمینان نصیب ہو رہا تھا اور اسماعیلی مؤمنین کے اندر بھی اس کی وجہ سے جماؤ پیدا ہو رہا ہے۔ اور اللہ تعالی طے کر چکا ہے کہ پوری طرح صراط مستقیم دکھا کے رہے گا، اور سارے احکام کی تکمیل کرتے رہے گا، اور یہ مخالفین حق اس کے خلاف طوفان اٹھاتے رہیں گے، وہ ماننے والے نہیں جب تک کہ قیامت نہ آ جائے اور کوئی دنیوی عذاب نہ آ پڑے، یہ نہیں مانتے تو نہ مانیں، اللہ قیامت کے دن فیصلہ کرے گا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر تھا، ہر ایک انعام یا سزا تک پہنچ کر رہے گا''۔

(۱) مولانا نے واضح کیا کہ جب بھی نبی آیا اس کی خواہش رہی کہ کتاب الٰہی اپنی صحیح شکل میں رہے اور کسی تحریف کا شکار نہ ہو۔

(۲) ینسخ کا مطلب اللہ قرآن کے ذریعہ اسے منسوخ کر رہا ہے۔

(۳) ما یلقی سے مراد یہود کی تحریفات اور ان کی بدعتیں ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب میں داخل کر دی تھیں۔

(۴) یحکم اللہ فی آیاتہ سے مراد اللہ آیتوں کے ذریعہ ایسا استحکام اور مضبوطی پیدا کر دیتا ہے جیسے کوئی مضبوط عمارت ہو جہاں کسی فساد اور کسی تحریف کی گنجائش نہیں ہوتی۔

(۵) واللہ علیم حکیم سے مراد یہ نیا حکم ہے جو قرآن میں آیا ہے، اللہ کے علم وحکمت پر مبنی ہے۔

(۶) لیجعل میں لام عاقبت کے لیے ہے تعلیل کے لیے نہیں، اس لیے اس کا ترجمہ مولانا اس طرح کرتے ہیں: ''نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے یہ حکم مزید گمراہی کا سبب بن گیا''۔

(۷) الذین فی قلوبھم مرض سے **مراد منافقین ہیں۔**

(۸) القاسیۃ قلوبھم سے **مراد یہود کی جماعت۔**

(۹) والظالمون سے **مراد مشرکین ہیں۔**

(۱۰) الذین اوتواالعلم سے **مراد مومنین ہیں خاص طور سے اہل کتاب مومنین۔**

حواشی و تعلیقات

(۱) پورا نام جلیل احسن بن علیم اللہ بن امیر علی، آپ کی ولادت ۲۵ر جنوری ۱۹۱۴ء اور دوسری روایت کے مطابق ۱۹۱۳ء ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں کرمینی میں ہوئی۔ چار سال کی عمر میں فالج کا حملہ ہوا، مشیت ایزدی کچھ اور تھی جس کی وجہ سے آنکھ اور ذہنی قوت محفوظ رہی۔ فالج کا اثر دائیں ہاتھ اور پیر پر تھا، لیکن ان تمام مجبوریوں کے باوجود اردو اور فارسی سیکھی نیز قرآن مجید حفظ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ گاؤں کے مدرسہ میں پرائمری اسکول سے فارغ ہو کر بلریا گنج میں مڈل اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ پھر ایک فرشتہ صفت انسان نے ان کی سوچ میں انقلاب برپا کر دیا، جب اس شخص نے مڈل اسکول سے واپسی کے وقت راستے میں یہ کہہ کر ان کے ذہن کو موڑ دیا کہ یہ کیا دنیاوی تعلیم حاصل کرتے ہو، جاؤ قرآن مجید کا مطلب سمجھو اور ٹانڈا چلے جاؤ۔

مولانا کا خیال ہے اللہ کی طرف سے یہ ایک غیبی مدد تھی، وہ اپنے نیک بندوں کو مختلف اوقات میں رہنمائی فرماتا رہتا ہے۔ چنانچہ آپ ٹانڈا، ضلع فیض آباد، یوپی چلے گئے اور قرآن حفظ کیا، فارسی پڑھی اور اس کے بعد عربی شروع کردی۔ یہاں سے مزید تعلیم کے لیے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات چلے گئے۔ پھر آپ دارالعلوم دیوبند گئے جہاں آپ نے مولانا اعزاز علیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (۱۸۸۵ء۔۱۹۴۹ء) سے بالترتیب ادب اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ندوۃ العلماء گئے تاکہ ادب میں مہارت حاصل کریں، وہاں مولانا ناظم ندویؒ (۱۹۱۴ء۔ ۲۰۰۰ء) سے استفادہ کیا، مولانا ناظم ندویؒ مولانا سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) کے شاگرد تھے اور ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے تھے۔ ندوہ میں مولانا عبدالرحمان ندوی کاشغریؒ (۱۹۱۲ء۔۱۹۷۲ء) جیسے اساتذہ سے بھی ادب وانشاء کے سلسلے میں کسب فیض کیا۔ یہاں سے فراغت کے بعد مولانا ناظم ندویؒ کی کوششوں سے مدرسہ اشاعت العلوم بریلی میں مدرس ہو گئے۔ مولانا یہیں سے جماعت اسلامی کے رکن بنے۔ اور مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۷۹ء) نے عربی پڑھانے کے لیے پٹھان کوٹ بلالیا اور وہیں رہ کر مسعود عالم ندویؒ (۱۹۱۰ء۔۱۹۵۴ء) کے ساتھ مولانا مودودی کی متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا (یہ واضح رہے کہ مولانا مسعود عالم ندویؒ جالندھر میں تھے جہاں دارالعروبہ کا مرکز تھا) لیکن وہاں کی آب و راس نہیں آئی۔ دوبارہ

دوسال کے بعد لوٹ کر بریلی کی ایک دوسری درسگاہ مصباح العلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ یہاں سے کچھ عرصہ کے بعد ۱۹۴۶ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ یوپی آگئے، یہاں ادب پڑھانے کے ساتھ قرآن بھی پڑھنے لگے، اور مولانا اختر احسن اصلاحیؒ اونچے درجات میں قرآن کی گھنٹیاں پڑھاتے تھے، ان کے درس میں بیٹھنے کی اجازت لے لی، اور اس دوران ان سے بھرپور استفادہ شروع کردیا اور پھر قرآن کے فکر وتدبر کی بلندیوں کو چھوتے چلے گئے، یہاں کم وبیش سات سال کا عرصہ گزارا۔ جماعت اسلامی ہند نے رامپور ثانوی درسگاہ کے قیام کا فیصلہ کیا تو جماعت نے آپ کو ۱۹۵۲ء میں ادب وقرآن پڑھانے کے لیے بلالیا، یہاں آپ کا قیام ۱۹۶۰ء تک رہا۔ درسگاہ بند ہوگئی تو آپ جماعت کے شعبہ تصنیف سے منسلک ہوگئے لیکن طبیعت تصنیف وتالیف کی طرف مائل نہ ہوئی، چنانچہ دوبارہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر تدریسی خدمت انجام دینے چلے گئے، لیکن ۱۹۶۲ء میں مدرسۃ الاصلاح سے جماعت کے تمام افراد کو سبکدوش کردیا گیا۔ مولانا بھی جماعت کے رکن تھے اس لیے آپ بھی وہاں سے سبکدوش ہوگئے۔ آپ یہاں سے انیس الدین احمد مرحوم سابق امیر حلقہ جماعت اسلامی بہار کی دعوت پر تدریس کے لیے چترپور چلے گئے (اس وقت جھارکھنڈ صوبہ میں ہے)۔ یہاں آپ کا قیام دوسال رہا۔ یہ درسگاہ اپنے مالی اسباب کی وجہ سے بند ہوگئی۔ ۱۹۶۴ء میں جامعۃ الفلاح بلریاگنج میں مکمل عربی درجات کا قیام عمل میں آیا، تو جماعت کے ذمہ داروں نے آپ کو تدریس کی ذمہ داریاں انجام دینے کے لیے بلالیا۔ انہوں نے آٹھ سال تک جامعۃ الفلاح بلریاگنج میں قرآن کی تدریس کے ساتھ ساتھ تحریک اسلامی کو فکری غذا پہنچانے کا کام کیا، الحمدللہ اب وہ تحریک اسلامی کا مرکز بن چکا ہے اور اس دوران اس جامعہ کی شہرت ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی ہے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد مولانا جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ یوپی کے ذمہ داروں نے آپ کو بلالیا لیکن وہاں کا ماحول راس نہ آیا چنانچہ مولانا عبدالرزاق سابق امیر حلقہ کی دعوت پر جامعہ دارلہدی محمد نگر آندھرا پردیش میں تدریس کے لیے چلے گئے۔ لیکن جامعۃ الفلاح کے ذمہ داروں کا اصرار بڑھتا رہا کہ دوبارہ جامعہ آجائیں چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوگئے اور ۱۹۷۳ء میں جامعہ تشریف لے آئے اور یہیں تدریس کا فریضہ انجام دیتے ہوئے ۵ رمضان المبارک مطابق ۸ جولائی ۱۹۸۱ء اپنے حقیقی رب سے جاملے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آپ تحریک اسلامی کے صف اول کے علماء میں سے تھے اور تحریک کے مختلف محاذوں میں عظیم خدمات، (تدریسی، دعوتی، تنظیمی اور علمی) انجام دی ہیں۔ (یہ معلومات ''حیات نو'' کے خصوصی اشاعت ہمارے اساتذہ نمبر اور روئداد جماعت اسلامی سے مستفاد)۔۔۔

(۲) نسائی

(۳) رواہ ابن حبان وقال شعیب الارنووط اسنادہ صحیح علی شرط مسلم

(۴) شرح کتاب فضائل القرآن من مختصر صحیح مسلم للامام المنذری باب استماع النبیؐ القرآن من غیرہ

(۵) رواہ احمد

(۶) صفوۃ الصفوۃ لابن الجوزی

(۷) تفسیر ابن کثیر، منقول فہم القرآن وتدبرہ دکتور احمد بن شرشال

(۸) طبری

(۹) تفسیر کبیر، صواعق منقول فہم القرآن وتدبرہ دکتور احمد بن شرشال

(۱۰) بخاری ومسلم

(۱۱) التفسیر الکبیر منقول فہم القرآن وتدبرہ احمد بن احمد بن معمر شرشال الجزائری

(۱۲) مقدمہ فی اصول التفسیر، ابن تیمیہ رح ص۳۹

(۱۳) سورہ ابراہیم:۴

(۱۴) سورہ یوسف:۱

(۱۵) برصغیر میں مطالعہ قرآن، علوم القرآن، تفاسیر، مفسرین، ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمان

(۱۶) برصغیر میں مطالعہ قرآن، علوم القرآن، تفاسیر، مفسرین، ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمان

(۱۷) مولانا مفتی محمد عبداللہ ٹونکی ہندوستان کے مشاہیر میں سے تھے، عربی ادب میں مولانا فیض الحسن کے شاگرد تھے، استاذ کے انتقال کے بعد اورینٹل کالج لاہور کی پروفیسری کی جگہ ان کو ملی اور عمر کا بڑا حصہ یہیں گزارا، اور اخیر زمانہ میں وہ دارالعلوم ندوہ کے صدر مدرس ہوئے، اور اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس ہوئے، اور بعارضہ فالج ۷/نومبر ۱۹۲۰ء کو بھوپال میں انتقال ہوا، وفات کے وقت مرحوم کی عمر ستر کے قریب تھی۔

(۱۸) مولانا اسماعیل میرٹھی ۱۲/نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے، فارسی کے ہیڈ، مولوی سہارنپور کے ضلع اسکول میں تھے، پہلے فارسی کے مدرس تھے، آگرہ سنٹرل نارمل اسکول میں ۱۲/سال فارسی کے مدرس رہے، پنشن کے بعد تصنیف وتالیف میں لگ گئے، ان کی خدمات کے صلہ میں ''خان صاحب'' کا خطاب ملا، بچوں کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ایک کلیات ان کی یادگار ہے، غزلیات کے علاوہ انھوں نے اخلاقی نظمیں، قصے، کہانی بھی لکھی ہیں، یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو میرٹھ میں انتقال ہوا۔۔

(۱۹) اسلامی انسائیکلو پیڈیا، سید قاسم محمود جلد اول

(۲۰) حیات شبلی ص۸۳

(۲۱) نظم قرآن کے فلسفہ کو جاننے کے لیے ان کی کتابیں'' نظام القرآن، دلائل النظام اور اسالیب القرآن'' پڑھنا ضروری ہے۔

(۲۲) حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندویؒ

(۲۳) مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے مختصر حالات زندگی جاننے کے لیے: ’’شیدائے قرآن‘‘ تالیف مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی صاحب کا مطالعہ مفید ہوگا، مزید ’’نقوش وتأثرات‘‘ از مولانا جلیل احسن ندوی رح کا مطالعہ بھی معلومات میں اضافہ کرے گا، لیکن ان کی عبقری شخصیت پر ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے جو ان کی قرآنی شخصیت کو منظر عام پر لا سکے اور شخصیت کے تعلیمی اور تربیتی پہلوؤں پر بھی محیط ہو۔

(۲۴) نقوش وتأثرات از مولانا جلیل احسن ندویؒ

(۲۵) قرآن میں نظم کلام کو بہت مربوط اور منظّم طریقہ سے امام حمید الدین فراہیؒ نے پیش کیا اور اس پر انہوں نے ایک مستقل کتاب لکھی، جس میں انہوں نے اپنے دلائل سے ثابت کیا کہ اللہ کی کتاب ایک منظّم اور مربوط کتاب ہے، اور اسے بغیر نظم کے صحیح طور سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے لیے انہوں نے عقلی اور نقلی دلائل دیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ’’ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے اور سورتوں کے مطالب میں بے نظمی جو بظاہر نظر آتی ہے محض قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ یہ بات ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ قرآن کی سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔ ہر سورہ میں اگر کوئی ایک متعین مقصد نہ ہوتا جس کے پورا ہونے سے سورہ سورہ پوری ہوتی ہو، تو یہ الگ الگ حد بندیوں کی کیا ضرورت تھی، سارے قرآن کو ایک ہی سورہ بنا دیا جاتا؟ نیز جب سورتوں کے لیے کوئی خاص مقدار نہیں ٹھہرائی گئی، بڑی چھوٹی ہر طرح کی سورتیں ہوئیں، تو اگر سورہ کے اندر کوئی نظمی وحدت مدنظر نہیں ہے تو آیتوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کیا ضرورت تھی۔ اجزاء یوں ہی بکھیر دیئے جاتے؟ اور اگر سطر سطر کے برابر کے اجزاء ہوتے جب بھی کوئی مضائقہ نہ ہوتا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آیات کا ایک مجموعہ ایک سورہ کے اندر ہے اور وہ سورہ کے نام سے موسوم ہوا۔ گویا ایک شہر بسا کر اس کے گرد شہر پناہ کھینچ دی۔ تو اب غور کرنے کی بات ہے کہ ایک شہر پناہ کے اندر کئی شہر کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ یہ واضح ہے کہ معانی کا تشابہ بھی ان کو ایک شہر پناہ کے اندر نہیں جمع کرتا۔ معوذتین باہم دگر جس قدر مشابہت رکھتی ہیں معلوم ہے۔ تاہم ان دونوں کو ایک سورہ نہیں قرار دیا گیا بلکہ دونوں دو مستقل سورتیں قرار پائیں۔ اسی طرح سورہ تکویر، انشقاق، مرسلات، نازعات، ذاریات سب ہم معنی سورتیں ہیں لیکن نظم اور اسلوب کلام کا ان میں فرق ہے۔

مزید وہ قرآن کے اندر مناسبت اور ترتیب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ قرآن میں ایک ہی چیز کبھی مختلف حیثیتوں میں ظاہر ہوتی ہے، ’’کبھی عمود کی حیثیت سے آتی ہے، کبھی ضمنی حیثیت سے، کبھی وہی چیز اجمال کے ساتھ آتی ہے، کبھی تفصیل کے ساتھ، کبھی ایک چیز مؤخر ہوتی ہے کبھی مقدم، کبھی تنہا ہوتی ہے کبھی اپنے مقابل کے ساتھ اور کبھی کسی چیز کے ساتھ اس کا جوڑا ہوتا ہے، کبھی کسی چیز کے ساتھ، بالکل یکساں مضمون مختلف سورتوں میں مختلف ترتیبوں کے ساتھ آتے ہیں، اسی کو قرآن اس طرح بیان کرتا ہے، انـظـر کیف

نصرف الآیات لعلھم یفقھون اور ہر ترتیب میں ایک خاص حکمت ملحوظ ہوتی ہے،عمود ہر سورہ کا ایک ہوتا ہے لیکن یہی بسا اوقات بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔عمود کے لیے ضروری نہیں کہ وہ عظیم الشان ہو بلکہ وہ ایک جامع بات ہوتی ہے۔(تفسیر نظام القرآن،امام حمید الدین فراہی)

(۲۶) مولانا امین احسن اصلاحیؒ اس نکتہ کی تشریح مزید یوں کرتے ہیں:''جن لوگوں نے قرآن کی جمع و ترتیب سے متعلق روایات پر غور کیا ہے وہ اس امر واقعہ سے انکار نہیں کر سکتے کہ قرآن اگر چہ جستہ جستہ نازل ہوا ہے،لیکن آیات کی ترتیب آں حضرتؐ کے حکم کے مطابق ہوئی،جو آیات اترتیں آپ خود سورتوں کے اندر ان کی جگہ متعین فرماتے اور کاتبین وحی کو حکم دیتے کہ ان آیتوں کو فلاں سورہ میں فلاں مقام پر رکھو۔اور کاتبین وحی آپ کی ہدایت کے مطابق ان آیات کو ان کی متعین جگہوں پر رکھتے۔چنانچہ اس بات پر تمام امت کا اتفاق ہے کہ آیت کی ترتیب،آں حضرتؐ کے حکم کے مطابق ہوئی۔سوال یہ ہے کہ اگر قرآن مجید میں نظم نہیں ہے تو آں حضرتؐ اس قسم کا حکم کیوں دیتے؟ پھر تو بہتر ترتیب نزولی ترتیب ہوتی؟ جس ترتیب سے آیتیں اترتی جاتیں،اسی ترتیب سے ان کو رکھواتے چلے جاتے؟ جب نزولی ترتیب چھوڑ کر ایک خاص ترتیب اختیار کی گئی تو اس امر پر غور کرنا پڑے گا کہ آخر اس نئی ترتیب کو اختیار کرنے کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ ظاہر ہے اس سوال کا صحیح جواب ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ترتیب مضامین کی مناسبت کے لحاظ پر قائم ہے۔۔۔۔ ہمارے اس خیال کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ قرآن مجید کے کسی حکم کے نازل ہونے کے بعد اگر کوئی ایسی آیت اتری جس میں اس حکم کے بارے میں اللہ تعالی نے کسی تخفیف یا ترمیم کا حکم دیا تو وہ آیت،خواہ سابق اصلی حکم کے کتنے ہی طویل زمانہ کے بعد نازل ہوئی ہو،لیکن بالعموم اس کو اسی سابق حکم کے ہی پہلو میں جگہ دی گئی۔اس کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور اگر کہیں اس اصول کی خلاف ورزی کی گئی ہے تو نظم کلام اور مناسبت مضمون کی اصولی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے''۔(مبادیٔ تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحیؒ ص:۱۹۳تا۱۹۴)

(۲۷) صلح حدیبیہ کے مطابق بنوخزاعہ مسلمانوں کے کیمپ میں اور بنوبکر قریش کے کیمپ میں شامل ہو گئے۔اور بنوخزاعہ اور بنوبکر میں پرانی دشمنی چلی آرہی تھی،صلح کی رو سے بنوبکر کو قریش کی ہمدردی مل گئی اور اپنا پرانا بدلہ لینے کا موقع مل گیا،اتنا ہی نہیں قریش نے بنوبکر کو ہتھیار سپلائی کیا بلکہ اس خونریزی میں شریک بھی ہوئے،جب بنوخزاعہ نے حرم میں پناہ لی تو وہاں بھی مسلمہ روایت کے خلاف وہاں بنوخزاعہ کا قتل عام کیا اور اس حرمت کا کچھ بھی نہیں خیال کیا جو حضرت ابراہیم کے زمانہ سے چلی آرہی تھی۔

(۲۸) عمرو بن سالم خزاعی نے رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچ کر کھڑے کھڑے یہ اشعار سنائے۔ اس وقت آپ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے:عمر بن سالم خزاعی نے کہا:

یـــا رب انـــی نـــاشـــد مـــحـــمـــدا حـــلـــفـــنـــا و حـــلـــف ابیـــہ الا تـــلـــدا

قـد كـنتـم ولـدا وكـنـا والـدا　　ثـمة اسـلـمـنـا و لـم نـنـزع يـدا
فـانـصـرـهـداك الـلـه ـنـصـرا ايـدا　　وادع عـبـاد الـلـه يـأتـوا مـددا
فيهـم رسـول الـلـه قـد تـجـردا　　ابيـض مثـل البـدر يسـمـو صـعـدا
ان سيـم خسـفـا وجهـه تـربـدا　　فـي فيـلـق كـالبـحـر يجـري مـزبـدا
ان قـريشـا اخـلـفـوك الـموعـدا　　ونـقـضـوا ميثـاقك الـمـؤكـدا
وجـعـلـوا لـي فـي كـداء رصـدا　　و زعـمـوا أن لسـت ادعـو أحـدا
وهـم أذل وأقـل عـددا　　هـم بيتـونـا بـالـوتيـر هـجـدا
و قتـلـوا ركـعـا و سـجـدا

ترجمہ: ’’اے پروردگار! میں محمدؐ سے ان کے عہد اوران کے والد کے قدیم عہد کی دہائی دے رہا ہوں۔
آپ لوگ اولاد تھے ہم والد، پھر ہم نے تابعداری اختیار کی اور کبھی دست کش نہ ہوئے۔
اللہ آپ کو ہدایت دے، آپ پرزور مدد کیجئے اور اللہ کے بندوں کو پکاریئے، وہ مدد کو آئیں گے۔
جن میں اللہ کے رسول ہوں گے ہتھیار پوش اور چڑھے ہوئے چودہویں کے چاند کی طرح گورے اور خوبصورت۔
اگر ان پر ظلم اوران کی توہین کی جائے تو چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔آپ ایک ایسے لشکر جرار کے اندر تشریف لائیں گے جو جھاگ بھرے سمندر کی طرح تلاطم خیز ہوگا۔
یقیناً قریش نے آپ کے عہد کی خلاف ورزی کی ہے، اور پختہ پیمان توڑ دیا ہے۔
انھوں نے کداء میں میرے لیے گھات لگائی اور یہ سمجھا کہ کسی کو مدد کے لیے نہیں پکاروں گا۔
حالانکہ وہ بڑے ذلیل اور تعداد میں کم ہیں۔
اور انھوں نے وتیر میں حملہ کیا اور ہمیں رکوع اور سجود کی حالت میں قتل کیا‘‘

(۲۹)　اس موضوع اور ان ہی آیات کے بارے میں مولانا جلیل احسن ندویؒ کا تدریسی نوٹ دو قسطوں میں تفصیل کے ساتھ ’’حیات نو‘‘ فروری ۱۹۸۷ء اور مارچ ۱۹۸۷ء کے دوشماروں میں طارق فارقلیط فلاحیؒ نے شائع کردیا تھا۔ یہ نوٹس مولانا نے ۱۹۷۶ء کے گروپ کو لکھایا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ہر سال اپنی قرآنی نئی معلومات کو طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے اور ہر وقت قرآن پر غور وفکر کام کرتے رہتے تھے، جستجو اور تحقیق ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی، ایسا قطعا نہیں تھا کہ ایک بات معلوم ہوگئی تو اس پر صبر کرلیا اور قانع ہوگئے۔
(۳۰)　سورہ نساء، تفہیم القرآن، جلد اول

امت دعوت، نہ کہ امت لعنت

ذکی الرحمن غازی فلاحی،استاذ جامعۃ الفلاح،بلریا گنج۔اعظم گڑھ

دعوت اسلام کا مطلب ہوتا ہے کسی کو مشرف بہ اسلام کر کے رحمتِ الٰہی میں داخلے کی طرف بلانا،جبکہ لعنت کا مطلب ہوتا ہے کسی کے بارے میں رحمتِ الٰہی سے دور ہونے کی خواہش ودعا کرنا۔ ظاہر بات ہے کہ دینِ رحمت اپنے پیروکاروں میں جو عمومی مزاج تشکیل دینا چاہتا ہے وہ دعوت ورحمت سے عبارت ہے، نہ کہ لعنت وقساوت سے۔اس سیناریو میں اگر ہم اپنی مساجد میں جمعے کے روز پڑھے جانے والے رٹے رٹائے یا لکھے لکھائے عربی خطبوں کا جائزہ لیں تو تعجب ہوتا ہے کہ امتِ دعوت اپنے ہفتے بھر بعد کے اجتماع میں جن دعاؤں پر سب سے زیادہ زور دیتی ہے وہ بلا وجہ مقفی ومسجع عبارتوں میں تمام غیر مسلم کفار ومشرکین کو موردِ لعنت ومستحقِ عذابِ الٰہی قرار دینا ہے۔قطعِ نظر اس سے کہ غیر مسلم تعلیم یافتہ برادرانِ وطن پر اس کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے، یا انسانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اس کی کیا حیثیت ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ طرزِ عمل خود اسلامی مزاج اور امتِ دعوت کی منصبی ذمہ داری سے فروتر اور متناقض ہے۔

آئندہ سطور کا پیشگی خلاصہ یہی ہے کہ بلا وجہ اس طرح کی عمومی بد دعائیں کرنا قرآن وحدیث سے ثابت شدہ اور سند یافتہ رویہ نہیں ہے۔یقیناً دینی نصوص میں اوصاف وحالات کی بنیاد پر یا ظلم وزیادتی کے جواب میں کسی کے خلاف بددعائیں مانگنے کا جواز ملتا ہے،لیکن اس استثنائی صورتِ حال کو عمومی اور کلّی رنگ دے دینا بھی صراطِ مستقیم سے ایک طرح کا انحراف ہی ہے۔سب سے پہلے قرآن وسنت کے نصوص کا ترجمہ دیکھ لیجیے،بعد ازاں ان سے مستفاد شرعی احکامات کو پیش کیا جائے گا۔وباللہ التوفیق:

ارشادِ باری ہے:﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظّاً غَلِيظَ الْقَلْبِ لاَنفَضُّواْ مِنْ حَوْلِكَ ﴾(آلِ عمران،۱۵۹)''یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد وپیش سے

چھوٹ جاتے۔''

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (انبیاء،۱۰۷) ''اے محمدؐ ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔''

علامہ ابن جریر طبریؒ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ اس آیتِ کریمہ میں اپنے رسولؐ سے فرماتا ہے کہ اے محمد! ہم نے تمہیں صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے، آپؐ کا رحمت ہونا ساری مخلوقات کے لیے ہے جن کی طرف آپؐ رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اس آیت کے معنی کی تعیین میں مفسرین کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا آپؐ کو جو ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے اس میں مومن و کافر دونوں داخل ہیں یا مراد خاص طور سے بس اہلِ ایمان ہی ہیں۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس میں پوری دنیا کے لیے رحمت ہونا مراد ہے جو کفار و مشرکین اور اہلِ ایمان سب کے حق میں عام ہے۔ یہ لوگ اپنی تائید میں حضرت ابنِ عباسؓ کا قول نقل کرتے ہیں جس کے بموجب آپؐ ساری دنیا کے لیے رحمت ہیں، تاہم اہلِ ایمان کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں رحمت ثابت ہوتے ہیں، جبکہ اہلِ کفر کے لیے آپؐ کی عمومی رحمت یہ ہے کہ آپ کے رہتے اب اُن پر کوئی عمومی عذاب نازل نہیں ہوگا جیسا کہ سابقہ اقوام و ملل کے اوپر ان کی سرکشی و عناد کی وجہ سے عمومی عذابِ الٰہی نازل ہوتے رہے ہیں۔ دیگر مفسرینِ کرامؒ کی رائے میں اللہ کے رسول ﷺ کا رحمت ہونا اہلِ ایمان کے ساتھ مخصوص ہے، نہ کہ سارے انسانوں بہ شمول کفار و مشرکین کے لیے عام ہے۔ ہمارے نزدیک دونوں اقوال میں قرینِ صحت و صواب قول وہی ہے جس کی تائید حضرت ابنِ عباسؓ کی رائے سے ہوتی ہے، یعنی آپ ﷺ سارے انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ مومنوں کے حق میں اس طرح کہ آپ ﷺ کے ذریعے سے انہیں ہدایت و ایمان کی توفیق ملتی ہے اور اس پر عامل ہو کر وہ جنت میں داخلہ پا لیتے ہیں، جبکہ کافروں کے حق میں اس طرح کہ آپ ﷺ کی وجہ سے ان پر سے دنیاوی عذاب مرفوع کر دیا گیا ہے جو کہ سابقہ رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں پر بارہا نازل ہو چکا ہے۔'' (دیکھیں: تفسیر طبریؒ: سورہ انبیاء، آیت ۱۰۷)

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ سے کہا گیا کہ مشرکین پر بددعا فرما دیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے لعّان (خوب لعنت کرنے والا) بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے، مجھے تو صرف رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔'' [**قيل يا رسول الله ﷺ ادع على المشركين، قال: إني لم أبعث لعانا وإنما بعثت رحمة**] (صحیح مسلمؒ: ۲۵۹۹۔ مسند ابو یعلیٰؒ: ۶۱۷۴۔ سنن کبریٰ، بیہقیؒ: ۱۴۰۳۔

الادب المفرد، بخاریؒ:۳۲۱)

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی مروی ہے کہ حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی اور ان کے رفقائے دین آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! قبیلۂ دوس نے کفر کی روش اختیار کر لی ہے اور اسلام لانے سے انکار کیا ہے، لہٰذا آپ ﷺ ان کے حق میں بددعا فرمادیں۔ حاضرین نے سنا تو چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں کہ اب تو دوس والے ہلاکت کے گھاٹ اتر گئے۔ لیکن آپ ﷺ نے دعا فرمائی: اے اللہ! قبیلۂ دوس کو ہدایت کی توفیق دے اور انہیں یہاں بلا دے۔'' [یارسول الله إن دوساً قد كفرت وأبت، فادع الله عليها، فقيل: هلكت دوس، فقال: اللهم اهد دوساً وائت بهم] (صحیح بخاریؒ: ۲۹۳۷، ۴۳۹۲، ۶۳۹۷۔ صحیح مسلمؒ: ۲۵۲۴۔ صحیح ابن حبانؒ: ۹۷۹، ۹۸۰۔ مسند احمدؒ: ۷۳۱۵، ۱۰۵۲۶)

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور قریب ہی ابوجہل اور اس کے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے کہا: تم میں کون فلاں کے اونٹ کی اوجھڑی لاکر بحالتِ سجدہ محمدؐ کی کمر پر رکھ سکتا ہے۔ ان میں کا بدبخت ترین آدمی کھڑا ہوا اور اوجھڑی لے آیا۔ وہ انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ جب آپ ﷺ سجدہ میں گئے تو اس نے اوجھڑی کو اٹھا کر کمر اور شانوں کے بیچ میں رکھ دیا۔ میں (عبداللہ بن مسعودؓ) دیکھ رہا تھا لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا اور کاش میرے پاس کچھ کر سکنے کی قوت ہوتی! بہر حال وہ لوگ ہنسنے لگے اور ایک دوسرے کا حوالہ دینے لگے۔ اللہ کے رسول ﷺ اس دوران سجدہ ہی میں رہے اور سر نہ اٹھایا تا آنکہ آپ ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ آئیں اور اوجھڑی کو کمرِ مبارک سے اتار کر پھینکا، اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے سرِ مبارک اٹھایا اور تین بار فرمایا: اے اللہ! تو ہی سزاوار ہے قریش کی پکڑ کرنے کا۔ ان کافروں کو آپ ﷺ کا بددعا فرمانا بڑا شاق گزرا کیونکہ ان کے نقطۂ نظر سے بلد حرام میں کی جانے والی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے نام لے لے کر بددعا کی اور فرمایا: ''اللہ تو پکڑ فرما ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کی۔'' یہاں آپ ﷺ نے سات نام لیے تھے لیکن ساتواں نام میرے (ابن مسعودؓ) حافظہ میں محفوظ نہ رہ سکا۔ لیکن اُس ذاتِ پاک کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! میں نے آپ ﷺ کے گنائے تمام لوگوں کی لاشوں کو بدر کے گڈھے میں پڑا دیکھا تھا۔'' [...فرفع رسول الله رأسه ثم قال: اللهم عليك بقريش، ثلاث مرات فشق عليهم إذ دعا عليهم، قال وكانوا يرون أن الدعوة فی ذالک البلد مستجابة، ثم

سمیٰ: اللهم علیک بأبی جهل وعلیک بعتبة بن ربیعة وشیبة بن ربیعة والولید بن عتبة وأمیة بن خلف عقبهة بن أبی معیط وعد السابع فلم یحفظ، قال: فوالذی نفسی بیده لقد رأیت الذین عد رسول الله صرعیٰ فی القلیب قلیب بدر] (صحیح بخاریؒ:۲۴۰، ۴۲۰، ۳۹۲۴ ۴۳۹۲۔صحیح مسلمؒ:۱۷۹۴۔صحیح ابن خزیمہؒ:۷۸۵۔مصنف ابن ابی شیبہؒ:۳۷۸۳۲،۳۷۷۱۸)

(۴) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: یقیناً جب اللہ کے رسول ﷺ کسی پر بددعا کرنے یا کسی کے حق میں دعا کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو (نماز میں) رکوع کے بعد قنوت پڑھتے۔ بسا اوقات آپ ﷺ فرماتے تھے: سمع الله لمن حمده، اے اللہ ہمارے پروردگار! ساری تعریفات تیرے لیے ہیں، تو ولیدؓ بن الولید، سلمہؓ بن ہشام اور عیاشؓ بن ربیعہ کو نجات دے، اے اللہ مضر پر اپنی سخت پکڑ فرما اور اس پکڑ کو قحط میں بدل دے جیسا کہ حضرت یوسف کا قحط تھا۔'' یہ جملے آپ ﷺ بآوازِ بلند ادا فرماتے تھے۔ بسا اوقات نمازِ فجر میں فرماتے تھے: اے اللہ فلاں ابن فلاں پر لعنت بھیج، مراد کچھ عربی قبائل ہوتے تھے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمادیا: ﴿لَیْسَ لَکَ مِنَ الْأَمْرِ شَیْءٌ أَوْ یَتُوبَ عَلَیْهِمْ أَوْ یُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُون﴾ (آل عمران، ۱۲۸) ''اے پیغمبر، فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے چاہے انہیں معاف کرے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔'' [أن رسول الله ﷺ کان إذا أراد أن یدعو علیٰ أحد أویدعو لأحد قنت بعد الرکوع فربما قال إذا قال سمع الله لمن حمده: اللهم ربنا لک الحمد انج الولید...اللهم اشدد وطأتک علی مضر واجعلها سنین کسنی یوسف، یجهر بذالک...اللهم العن فلاناً وفلاناً لأحیاء من العرب حتی أنزل الله: لَیْسَ لَکَ مِنَ الْأَمْرِ..] (صحیح بخاریؒ:۴۵۶۰، ۶۳۹۳، ۶۹۴۰۔صحیح مسلمؒ:۶۷۵۔سنن ابوداؤدؒ:۱۴۴۴۔صحیح ابن حبانؒ:۱۹۶۹، ۱۹۸۶، مصنف ابن ابی شیبہؒ:۷۱۱۹)

(۵) حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فجر کی نماز میں دوسری رکعت میں رکوع کے بعد کہتے سنا تھا: اے اللہ تو ہمارا پروردگار ہے اور تیرے لیے ہی سب تعریفیں ہیں، اے اللہ! تو فلاں اور فلاں پر لعنت بھیج۔ اسی واقعہ کے بعد یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تھی کہ: ﴿لَیْسَ لَکَ مِنَ الْأَمْرِ شَیْءٌ أَوْ یَتُوبَ عَلَیْهِمْ أَوْ یُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُون﴾ (آل عمران، ۱۲۸) ''اے پیغمبر، فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے چاہے انہیں معاف کرے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔'' [یقول فی صلاة الفجر ورفع رأسه من

الركوع...اللهم العن فلانا وفلانا حتى أنزل الله..](صحیح بخاریؒ:۴۰۷۰،۴۵۵۹، ۷۳۴۶۔مسند احمدؒ:۵۶۷۴۔صحیح ابن حبانؒ:۱۹۸۷،۷۴۷۵۔صحیح ابن خزیمہؒ:۶۲۲)

(۶) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے غزوۂ احد کے دن فرمایا تھا کہ اے اللہ ابوسفیان پر، حارث بن ہشام پر اور صفوان بن امیہ پر لعنت بھیج، چنانچہ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی کہ: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ﴾ (آل عمران، ۱۲۸) ''اے پیغمبر، فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے چاہے انہیں معاف کرے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔'' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی توبہ قبول کر لی اور یہ سب اسلام لے آئے اور ان کی اسلامی سیرت اچھی ہوگئی۔'' [قال يوم أحد: اللهم العن أبا سفيان، اللهم العن الحارث بن هشام، اللهم العن صفوان بن أميه!فنزلت الآية...فتاب الله عليهم فأسلموا فحسن إسلامهم](مسند احمدؒ:۶۵۷۴۔سنن ترمذیؒ: ۳۰۰۴ مع تصحیح البانیؒ۔تفسیر طبریؒ:۷/۲۰۰۔تاریخ دمشق، ابن عساکرؒ:۱۱/۴۹۴،۲۴/۱۰۹،۲۴/۱۱۰)

(۷) حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان لوگوں کے حق میں بددعائیں کی تھیں جنہوں نے ''بئرِ معونہ'' میں آپ ﷺ کے اصحابؓ کو قتل کیا تھا اور بددعا کرنے کا یہ سلسلہ تیس دن تک چلا تھا، اس میں آپ ﷺ قبیلہ ''رعل'' اور قبیلہ ''لحیان'' اور قبیلہ ''عصیہ'' پر بددعا کرتے تھے کیونکہ ان قبائل نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی راہ اختیار کی تھی۔'' [دعا النبی ﷺ على الذين قتلوا يعنى أصحابه ببئر معونة ثلاثين صباحا حين يدعو علىٰ رعل ولحيان وعصية عصت الله ورسوله](مؤطا مالکؒ:۱۹۶۴۔صحیح بخاریؒ:۲۸۰۱،۲۸۱۴، ۴۰۹۱،۴۰۹۵۔صحیح مسلمؒ:۶۷۷)

(۸) حضرت خفافؓ بن ایماء کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے رکوع کیا ور پھر سر اٹھا کر فرمایا: قبیلہ غفار کی اللہ مغفرت فرمائے، قبیلۂ اسلم کو اللہ سلامت رکھے، قبیلۂ عصیہ نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی ہے، اے اللہ تو لعنت بھیج قبیلہ بنولحیان پر اور لعنت بھیج قبیلۂ رعل وقبیلۂ ذکوان پر۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے سجدہ فرمایا۔ حضرت خفافؓ کہتے ہیں کہ اس (عملِ رسول ﷺ) کی وجہ سے کفار پر لعنت رکھ دی گئی۔'' [فجعلت لعنة الكفرة من أجل ذالک](صحیح مسلمؒ:۶۷۹۔مسند احمدؒ:۱۶۶۸۷۔صحیح ابن حبانؒ:۱۹۸۴۔مصنف ابن ابی شیبہؒ:۷۱۲۵)

(۹) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: یقیناً جب اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں کی

جانب سے اعراض وادبار دیکھا۔ اور (دوسری روایت میں ہے کہ) جب قریش اللہ کے رسول ﷺ پر مسلط ہوگئے اور عصیان برتنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! سات سال ایسے جیسے کہ حضرت یوسفؑ کے تھے۔'' اس دعا کے نتیجہ میں قریش کو قحط سالی نے آ لیا جس میں ہر چیز ہلاک ہوگئی حتیٰ کہ لوگ چمڑا، مردار اور سڑی چیزوں کو کھانے پر مجبور ہوگئے۔ ہر شخص آسمان کی طرف دیکھتا تو شدتِ بھوک سے اسے ایک دھواں سا دکھائی پڑتا تھا۔ اس کے بعد ابوسفیان (اس وقت کے قریشی سردار) آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اے محمد ﷺ! آپ طاعتِ خداوندی اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں، آپ ﷺ کی قوم ہلاک ہوئی جاتی ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے۔ (دوسری روایت میں ہے کہ) ان لوگوں نے یہ دعائیں کرنا شروع کردی تھیں کہ اے ہمارے رب! ہم سے عذاب ہٹا دیجئے کہ ہم ایمان لے آتے ہیں۔ آپ ﷺ سے کہا گیا تھا کہ اگر ہم اُن سے عذاب ہٹا دیں گے تو یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں گے، تاہم آپ ﷺ نے اپنے رب سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے (عذاب) ہٹا دیا، لیکن یہ لوگ اپنے اعتراف سے پھر گئے۔ اس روگردانی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان سے غزوۂ بدر میں انتقام لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے نازل فرمایا تھا: ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاء بِدُخَانٍ مُّبِينٍ☆يَغْشَى النَّاسَ هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ☆رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ☆أَنَّى لَهُمُ الذِّكْرَى وَقَدْ جَاءهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ☆ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ☆إِنَّا كَاشِفُو الْعَذَابِ قَلِيلاً إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ☆يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَى إِنَّا مُنتَقِمُونَ﴾ (الدخان، ۱۰-۱۶) ''اچھا، انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا، یہ ہے دردناک سزا۔ (اب کہتے ہیں) پروردگار ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں۔ ان کی غفلت کہاں دور ہوتی ہے؟ اِن کا حال تو یہ ہے کہ ان کے پاس رسولِ مبین آ گیا، پھر بھی یہ اس کی طرف ملتفت نہ ہوئے اور کہا: یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے۔ ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں، تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔ جس روز ہم بڑی ضرب لگائیں گے، وہ دن ہوگا جب ہم تم سے انتقام لیں گے۔'' چنانچہ وہ کاری ضرب معرکۂ بدر کی صورت میں ہوئی اور دھوئیں، کاری ضرب، ''لزام'' اور روم کی نشانیاں گزر گئی ہیں۔'' [...إن قريشاً لما غلبوا النبي ﷺ واستعصوا عليه قال: اللهم سبع كسبع يوسف...فالبطشة يوم بدر وقد مضت الدخان والبطشة واللزام وآية الروم] (صحیح بخاریؒ: ۱۰۰۷، ۱۰۲۰، ۴۷۷۴، ۴۶۹۳، ۴۸۰۹، ۴۸۲۱، ۴۸۲۲، ۴۸۲۳، ۴۸۲۴، ۴۸۲۴۔ صحیح مسلمؒ: ۲۷۹۸۔ سنن ترمذیؒ: ۳۲۵۴۔ مسند احمدؒ: ۳۶۱۳)

(۱۰) حضرت عبید بن عمرؓ فرماتے ہیں: یقیناً حضرت عمرؓ نے رکوع کے بعد قنوت (نازلہ) پڑھی اور کہا: اے اللہ مغفرت فرما ہماری، مومن مردوں اور عورتوں کی، مسلم مردوں اور عورتوں کی، ان کے دلوں کو جوڑ دے اور آپسی معاملات سدھار دے اور ان کے اور تیرے دشمنوں کے مقابلے میں اُن کی مدد فرما۔ اے اللہ لعنت بھیج (ایک روایت میں یہاں ''عذاب دے'' کا لفظ ہے) اہلِ کتاب کے کافروں پر جو تیری راہ سے روکتے ہیں، تیرے رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں اور تیرے اولیاء سے جنگ کرتے ہیں۔ اے اللہ! ان کے اتفاق میں اختلاف پیدا فرما، ان کے قدموں کو ہلا دے اور ان پر اپنی ایسی سزا نازل فرما جو تو کسی مجرم قوم سے نہیں پھیرتا ہے۔'' [أللھم اغفر لنا وللمومنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات وألف بین قلوبھم وأصلح ذات بینھم وانصرھم علیٰ عدوک وعدوھم، اللھم العن کفرۃ أھل الکتاب الذین یصدون عن سبیلک ویکذبون رسلک ویقاتلون أولیائک، اللھم خالف بین کلمتھم وزلزل أقدامھم وأنزل بھم بأسک الذی لاتردہ عن القوم المجرمین] (مصنف عبدالرزاقؒ: ۴۹۶۹۔ سنن کبری، بیہقیؒ: ۲/۲۱۰۔ تصحیح البانیؒ فی إرواء الغلیل: ۴۲۸)

مستفاد شرعی احکام وھدایات

مذکورہ بالا قرآن وحدیث کے نصوص کی مجموعی دلالت سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ غیر مسلموں پر لعنتیں بھیجنے اور ان کے حق میں بددعائیں کرنے کا حکم اُن کے اوصاف وافعال کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ بظاہر محولہ بالا دینی نصوص متناقض ومتصادم نظر آتی ہیں، لیکن حقیقت وہی ہے جو اوپر گزری کہ غیر مسلموں کے احوال اور اہلِ اسلام کے ساتھ ان کے تعامل کی روشنی میں ان کا شرعی حکم مختلف ہوتا رہتا ہے۔ ذیل میں اس اجمال کی کسی قدر وضاحت کی جاتی ہے:

۱) اللہ کے رسول ﷺ کی دائمی سنت وطریقہ اور آپ ﷺ کی سنت کی نقش بہ نقش پیروی کرنے والوں کا ہمیشہ سے یہی طرزِ عمل رہا ہے کہ لعنت ملامت بھیجنے سے اجتناب کیا جائے کیونکہ یہ طرزِ عمل دینِ رحمت کے مزاج اور عام انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ امتِ مسلمہ کو قرآنِ کریم میں امتِ دعوت قرار دیا گیا ہے، اور داعی کی غرض یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح مخلوقِ خدا تک دینِ حق کا پیغام پہنچا دیا جائے، اس تڑپ کے پسِ پشت دراصل رحمت وہمدردی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اس طور پر دیکھیں تو افرادِ امت یا ائمۂ مساجد کا کفار ومشرکین کو مستقل طور سے ملعونیت اور بددعاؤں کا ہدف بنالینا خود امتِ مسلمہ کے مقصدِ وجود کے منافی اور دینِ دعوت کے مزاج کے خلاف ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ کے

رسول ﷺ لعّان (ہر آن لعنت ملامت کرنے والے) نہ تھے۔[**لم یکن النبی ﷺ لعانا**](صحیح بخاری:۶۰۳۱، ۶۰۴۶۔مسند احمدؒ:۴/۱۲۲۷،۱۲۴۶۳، ۱۲۶۰۹۔طبقات ابن سعدؒ:۱/۱۲۶)احادیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نہ فحش گو تھے نہ فحش پسند، نہ بدگو تھے نہ لعنت گر اور نہ ہی آپ ﷺ بازاروں میں شور شرابہ کرنے والے تھے۔[**لم یکن رسول اللہ ﷺ سبابا ولا فحاشا ولالعانا ولا سخابا فی الأسواق**](مسند ابن الجعدؒ:۲۷۵۵۔تاریخ دمشق،ابن عساکرؒ:۳/۳۷۲)روایات میں آتا ہے کہ کسی کو ڈانٹتے ہوئے آپ ﷺ کی زبان سے صرف اتنا نکلتا تھا کہ اسے کیا ہوگیا ہے، اس کی پیشانی خاک آلود ہوجائے! [**کان یقول یقول لأحدنا عند المعاتبة ماله تربت جبینه**](سنن کبری،بیہقیؒ: ۱۰/۱۹۳۰۔الادب المفرد، بخاریؒ: ۴۳۰، تاریخ دمشق، ابن عساکرؒ:۳/ ۳۶۷)مزید برآں آپ ﷺ نے اس قسم کے طرزِ عمل کو مومنانہ طرزِ عمل کے خلاف قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''مومن طعنے کسنے والا، لعنتیں کرنے والا، فحش گو اور بدزبان نہیں ہوتا ہے۔''[**لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذیء**](مسند بزارؒ:۱۵۲۳۔مسند ابویعلیؒ:۵۰۸۸، ۵۳۷۹۔متدرک حاکمؒ:۱/ ۵۷۔مصنف ابن ابی شیبہؒ:۴/۱۰۹۷۔مسند احمدؒ: ۳۸۳۹)آپ ﷺ نے لعنت کرنے کو اپنا تکیہ کلام بنالینے والوں کے بارے میں فرمایا ہے: ''بہت زیادہ لعنت کرنے والے روزِ قیامت نہ سفارشی بنائے جائیں گے اور نہ ہی گواہ۔''[**لایکون اللعانون شفعاء ولاشهداء یوم القیامة**](صحیح مسلمؒ: ۲۵۹۸۔سنن ابوداؤدؒ:۴۹۰۷۔صحیح ابن حبانؒ:۵۷۴۶۔مسند احمدؒ:۲۷۵۲۹)نیز فرمایا: ''کسی صدیق (سچ بولنے والے) کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ لعنتیں کرنے والا ہو۔''[**لاینبغی لصدیق أن یکون لعانا**](صحیح مسلمؒ:۲۵۹۷۔مسند احمدؒ:۸۴۴۷،۸۷۸۲۔شعب الایمان،بیہقیؒ:۵۱۵۱۔الادب المفرد، بخاریؒ:۳۱۷)

۲) لعنت کا مطلب ہے خدا کی رحمت سے دوری و مہجوری ہونا۔ لہٰذا ہر وہ شخص جس کی موت حالتِ کفر پر ہونا متحقق و متیقن نہ ہو، اس کے بارے میں گمان رکھنا چاہیے کہ اگر اس نے زندگی کے کسی لمحہ میں توبہ وانابت کر لی ہوگی تو اللہ کی رحمت کا مستحق ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو اس بات سے منع کر دیا گیا کہ کفارِ قریش، جو کہ اسلام کے کھلے دشمن تھے، کے سرخیلوں کا نام لے لے کر بالتعیین ان پر لعنت نہ بھیجی جائے، پھر وہ ابوسفیانؓ، حارثؓ بن ہشام یا صفوانؓ بن امیہ جیسے صفِ اول کے قائدینِ کفر وضلالت ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ اس وقت تک حالتِ کفر میں ان کی موت واقع نہیں ہوئی تھی، اس لیے امکان باقی تھا کہ وہ ہدایت پا جائیں اور فی الواقع مستقبل میں ایسا ہوا بھی۔ جہاں تک

تعلق ہے عمومی انداز میں ظالموں اور مفسدوں پر لعنت کرنے کا تو یہ مسلمان اور غیر مسلمان سب کے لیے عام ہے، کیونکہ اس قسم کی لعنت خود قرآنِ کریم میں صراحت کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿إِنَّ الَّـذِيْـنَ يَـكْتُـمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِيْ الْكِتَابِ أُولَـــئِكَ يَـلـعَنُهُمُ اللّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴾ (بقرہ،۱۵۹) ''جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآں حالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی اُن پر لعنت بھیجتے ہیں۔''

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّهِ وَالْمَلآئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْـمَـعِيْـن ☆ خَـالِـدِيْنَ فِيْهَا لاَ يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلاَ هُمْ يُنظَرُونَ ﴾ (بقرہ،۱۶۱-۱۶۲) ''جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دی، ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اسی لعنت کی زندگی میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں پھر کوئی دوسری مہلت دی جائے گی۔''

﴿وَمَنْ أَظْلَـمُ مِـمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللّهِ كَذِباً أُوْلَـئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَى رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الأَشْهَـادُ هَــؤُلاء الَّذِيْنَ كَذَبُواْ عَلَى رَبِّهِمْ أَلاَ لَعْنَةُ اللّهِ عَلَى الظَّالِمِيْن ☆ الَّذِيْنَ يَصُدُّونَ عَـن سَبِيْـلِ الـلّـهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجاً وَهُم بِالآخِرَةِ هُمْ كَافِرُون ﴾ (ہود،۱۸-۱۹) ''اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے؟ ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو! خدا کی لعنت ہے ظالموں پر۔ ان ظالموں پر جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں، اس کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔''

ان آیات میں مذکورہ لعنت کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوگا جو اس قسم کی لعنت کے مستوجب کسی صفت سے متصف ہے۔ مستوجبِ لعنت صفات کا پایا جانا مسلم وغیر مسلم سب میں عام ہے۔ صحیح احادیث میں صراحت کے ساتھ سود کھانے والے، سود دینے والے، سودی معاملہ کے گواہ اور کاتب پر لعنت کی گئی ہے۔ [لعن رسول الله ﷺ آكل الربا وموكله وشاهده وكاتبه] (صحیح مسلمؒ: ۱۵۹۸۔ مسند احمدؒ: ۱۴۲۶۳۔ مسند ابویعلیؒ: ۱۸۴۹، ۱۹۶۰۔ مسند ابوعوانہؒ: ۵۴۵۳، ۵۴۵۵۔ سنن صغری، بیہقیؒ: ۱۸۵۲) نیز بادہ خواروں، شراب پلانے والوں، بیچنے والوں، خریدنے والوں، کشید کرنے اور کرانے والوں، منتقل

کرنے والوں، منگانے والوں اور اس کی قیمت کھانے والوں سب پر صراحت ووضاحت کے ساتھ لعنت کی گئی ہے۔[لعن النبی ﷺ الخمر وشاربها وساقیها وبائعها ومبتاعها وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة إلیه وآکل ثمنها](مصنف ابن ابی شیبہؒ:۲۲۰۴۵۔مسند احمدؒ: ۴۷۸۷، ۵۳۹۱۔سنن ابن ماجہؒ: ۳۳۸۰۔سنن ابوداؤدؒ: ۳۶۷۴) اسی طرح سے رشوت لینے اور دینے والے پر[لعن الراشی والمرتشی فی الحکم](سنن ترمذیؒ:۱۳۳۶۔مسند احمدؒ:۹۰۱۱، ۹۰۱۹۔ مسند بزارؒ: ۸۶۷۲۔شرح مشکل الآثار، طحاویؒ: ۵۶۶۲۔صحیح ابن حبانؒ: ۵۰۷۶۔الدعاء، طبرانیؒ: ۲۰۹۵) اپنے والدین کو ملعون کہنے والے، غیر اللہ کے لیے جانور ذبح کرنے والے اور راستوں کی علامات بگاڑنے والوں پر[لعن من لعن والدیه ولعن من ذبح لغیر الله ولعن من غیر منار الأرض](صحیح مسلمؒ:۱۹۷۸۔مصنف ابن ابی شیبہؒ:۲۲۴۴۹۔مسند احمدؒ:۱۳۰۷۔سنن نسائیؒ: ۴۴۷۵۔صحیح ابن حبانؒ:۶۶۰۴) حلالہ کا نکاح کرنے اور کرانے والوں پر[لعن المحلل والمحلل له](مسند احمدؒ: ۴۳۰۸۔مسند ابویعلیؒ:۵۰۵۴۔مسند الشاشیؒ:۸۶۲۔شرح السنۃ، بغویؒ:۲۲۹۳) اور اس کے علاوہ متعدد گناہوں کے مرتکب اشخاص پر زبانِ رسالت ﷺ سے لعنت بھیجی گئی ہے۔(مثال کے طور پر دیکھیں: صحیح الجامع الصغیر وزیادتہ: ۵۰۸۹-۵۱۱۴۔کتاب الاذکار، نوویؒ: ص۴۸۰ فصل: فی جواز لعن اصحاب المعاصی غیر المعنیین والمعروفین۔مصنف عبدالرزاقؒ:۱۰۷۹۳۔الدعاء، طبرانیؒ: ۲۱۶۹) یہ سب احادیث دلالت کرتی ہیں کہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کی انواع پر لعنت بھیجی جاسکتی ہے البتہ اعیان یعنی افراد کی تخصیص کے ساتھ لعنت نہیں کی جائے گی۔(زاد المعاد، ابن القیمؒ: ۵/۵۳)

کسی بھی غیر مسلم کو تعیین کے ساتھ مورد لعنت قرار دینا، جمہور علمائے اسلام کے نزدیک جائز نہیں ہے۔(البحر المحیط، ابن حیان القرطبیؒ: سورہ بقرہ، ۱۶۰) تعیین کے ساتھ لعنت کرنے کے اِس عدمِ جواز میں مسلمان فساق وفجار بدرجۂ اولیٰ داخل مانے جائیں گے۔امام غزالیؒ نے اس ممانعت کی علت بھی بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں: کیونکہ بہت ممکن ہے کہ وہ (متعینہ شخص) اسلام لے آئے اور مرتے وقت اللہ کا مقرب بندہ ہوکر مرے، اس لیے ملعون کہہ کر کیسے حکم لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے رحمت الٰہی سے محروم ہوگیا ہے۔اب اگر کوئی صاحب اعتراض کریں کہ ہم فی الوقت کسی کافر کو ملعون اُسی طرح کہتے ہیں جیسے کسی مسلمان کو رحمة اللّٰه علیک (تجھ پر اللہ کی رحمت ہو) کہتے ہیں، حالانکہ جس طرح کسی کافر کے بارے میں امکان ہے کہ وہ آئندہ کبھی اسلام لاسکتا ہے، اسی طرح کسی مسلمان کے بارے میں بھی ممکن ہے کہ وہ آئندہ کبھی مرتد ہوسکتا ہے، چنانچہ جس طرح ہم مستقبل کے احتمال کی وجہ سے مسلمان کو

رحمت کا مستحق کہنا نہیں چھوڑتے اسی طرح کسی کافر کو مستقبل کے احتمال کی وجہ سے لعنت کا مستحق کہنا کیوں چھوڑ دیں۔ یہاں بنیادی غلطی ''رحمة اللّٰہ علیک'' (تجھ پر اللہ کی رحمت ہو) کا مفہوم سمجھنے میں ہوئی ہے۔ جان لیجئے کہ جب ہم کسی مسلمان کو رحمت کی دعا دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہمیں اس کے جنتی ہونے کا کامل یقین ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس مسلمان کو طاعتِ اسلام پر ثابت قدم رکھے جو کہ رحمتِ الٰہی کا سبب ہے۔ یعنی ہم کسی کے بارے میں فیصلہ نہیں کرتے کہ وہ یقیناً اللہ کی رحمت کا مستحق بن گیا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر ہم کافر کو اس کے موجودہ کفر کی وجہ سے لعنت کا مستحق مانتے ہوئے ملعون کہیں تو اس کے معنی ہوں گے کہ ہم اس کے لیے دعا کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے کفر و مخالفتِ اسلام پر ثابت قدم رکھے جو کہ لعنت کا سبب ہے۔

کسی کے بھی بارے میں اس طرح سے کفر کی دعا کرنا بذاتِ خود کفر ہے۔ (یہاں ذہن میں رہنا چاہیے کہ جن علمائے کرام نے متعینہ طور سے کسی کافر پر لعنت بھیجنا جائز مانا ہے- جیسا کہ احکام القرآن میں علامہ ابن العربیؒ کا موقف ہے: ۱/۴۷۔ انہوں نے کافر پر لعنت بھیجنے میں یہ معنی ملحوظ نہیں رکھے ہیں جو امام غزالیؒ یہاں بیان کر رہے ہیں، بلکہ موجودہ حالت پر حکم لگاتے ہوئے اسے جائز کہا ہے۔ اس لیے ایسے علمائے دین پر امام غزالیؒ کی بیان کردہ توجیہ وارد کرتے ہوئے کفر کا فتویٰ لگانا کسی حال میں درست نہیں ہوگا۔ خود امام غزالیؒ نے اپنی اس توجیہ کو دوسروں پر لازم نہیں مانا ہے بلکہ اپنے مخالف قول کی کمزوری دکھانے کے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں) اس قسم کی لعنت کا جواز اسی صورت ہوسکتا ہے جب کہ لعنت کے ساتھ، حالتِ کفر پر مرنے کی شرط جوڑ دی جائے یعنی کہا جائے کہ فلاں کافر پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ کفر پر مرے اور لعنت نہ ہو اگر وہ اسلام پر مرے۔ اس قسم کی لعنت بذاتِ خود ایک تکلف و تصنع محسوس ہوتی ہے، مزید برآں یہ ایک غیبی امر ہے جو مجہول ہے۔ مطلقاً کسی کو لعنت کرنے میں دونوں قسم کے احتمالات (یعنی لعنت کا سچا ہونا یا جھوٹا ہو جانا) ہیں جو کہ خطرناک بات ہے، جبکہ اس لعنت گری کے وطیرہ سے کلی اجتناب کرنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ یہ حکم تو کسی کافر کے بارے میں تھا، اب کسی مسلمان فاسق و بدعتی کے بارے میں یہی حکم بدرجۂ اولیٰ مسلّم مانا جائے گا۔ بہر حال متعین اشخاص پر لعنت کرنے میں بڑا خطرہ ہے کیونکہ انسانی حالات بدلتے رہتے ہیں، جبکہ اوصاف پر لعنت کا معاملہ ایسا نہیں ہوتا۔''
(احیاء علوم الدین۔غزالیؒ: ۳/۱۲۴) سابقہ بالا آیات واحادیث سے بھی اس شرعی مسلک کی تائید ہوتی ہے۔

۳) بسا اوقات مسلمانوں کو واقعی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ محاربین اور دشمن کافروں کے افراد و جماعتوں کے ظلم و ستم اور زیادتی و سرکشی کے خلاف اللہ تعالیٰ سے دعائیں کریں اور نالۂ نیم شبی میں

ان پر بددعاؤں اور لعنتوں کے تیر آزمائیں۔ کافروں کے ظلم وستم کے مقابلے میں اور ان کے شر کو دفع کرنے کے لیے ہر ممکنہ اسلحہ آزمایا جاسکتا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایک مومن کی دعائیں اور بارگاہِ رب میں کی گئی مناجاتیں اور نصرت واعانت کی درخواستیں اُس کا ایسا ہتھیار ہیں جو اپنی عظمت، قوت اور اثر آفرینی میں بے مثال و بے نظیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بھی کفر و باطل کی جارحانہ قوتوں، کافر محاذ کے اماموں اور سرخیلوں کے مقابلے میں اس ہتھیار سے کام لیا تھا اور اس کے نتیجے میں اُن کا انجام یہ ہوا کہ سب کے سب غزوۂ بدر میں کام آ گئے، حالانکہ یہ اہلِ اسلام اور اہلِ کفر کے مابین پہلا ہی معرکہ تھا۔ تاہم جو بات نوٹ کر لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس طرزِ عمل کو مستقل اختیار نہیں کیا تھا۔ کسی بھی حدیث میں یہ صراحت نہیں ملتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے استثنائی حالات میں کی جانے والی ان بددعاؤں کو عمومی رنگ دیا تھا اور یہ کہ قرنِ اول کے مدنی معاشرے میں ہر جمعہ کے خطبہ میں اس طرح کی بددعاؤں کو جزوِ لاینفک سمجھا جاتا تھا۔

امام ابن تیمیہؒ کا تجزیہ اس بابت نہایت اہم ہے، وہ لکھتے ہیں: ظالم و جابر کفار کی زیادتی کے مقابلہ اللہ کے حضور شکایتیں کرنا نہ صرف مشروع ہے بلکہ ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسی کی وجہ سے قنوتِ نازلہ رکھی گئی ہے جس میں مومنین کے لیے دعا اور ظالم کافرین کے لیے اللہ کے حضور شکایات کا بکھان ہوتا ہے۔ تاہم متعین و مخصوص اشخاص کا نام لے کر ان کے حق میں بددعائیں کرنے کا نبوی عمل منسوخ ہو چکا ہے۔ اس عمل کو منسوخ کرنے والی آیت یہ ہے: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ﴾ (آل عمران، ۱۲۸) ''اے پیغمبر، فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے چاہے انہیں معاف کر دے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔'' اس کی وجہ یہی ہے کہ کسی متعین انسان کے بارے میں ہم فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے کفر پر ہلاکت مقدر فرما دی ہے یا نہیں۔ ایسا بالکل ممکن ہے کہ اللہ ایسے سرکش کافروں کو توبہ کی توفیق بخش دے۔ اس کے برخلاف طرزِ عمل یہ ہے کہ ظلم و بربریت اور شر و فساد سے متصف پوری جنس موصوف کے خلاف اللہ سے شکایتیں کی جائیں، اس کی بارگاہ میں ظالموں کے ظلم کے خلاف گہار لگائی جائے جس میں دینِ اسلام اور اس کے متبعین کی عزت و شوکت مقصود ہو اور دشمنانِ خدا کی ذلت و نابودی مراد ہو، تو ایسی دعائیں مانگنا شرعاً مستحب و مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اصحاب ایمان سے محبت رکھتا ہے اور ان کا غلبہ و فتح مندی چاہتا ہے اور کفر و ملتِ کفر کی مغلوبیت اسے پسند ہے، اس لیے اس قسم کی دعائیں کرنا گویا اُس چیز کی دعا کرنا ہوا جسے خود اللہ رب العزت پسند فرماتا ہے۔

البتہ متعین طور سے کسی کافر کے بارے میں بددعائیں کرنے کا عمل جس میں دعا کرنے والے کے علم میں نہ ہو کہ مدعو علیہ کا خاتمہ ایمان پر ہوگا یا غیر ایمان پر ہوگا، تو ایسا کرنے کا ہمیں حکم نہیں دیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ پہلے پہل ایسا کرتے تھے، لیکن بعد میں آپ ﷺ کو اس سے روک دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ کسی کو بھی مستحقِ عذاب یا مستحقِ رحمت متعین کرنے کا حق خالصتاً اللہ تعالیٰ کے اختیار و ارادہ پر منحصر ہے۔ حضرت نوحؑ نے تمام اہلِ زمین کی ہلاکت کی جو بددعا کی تھی وہ اسی وقت کی تھی جب کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتادیا تھا کہ اب اُن کی قوم میں سے کوئی اور ایمان لانے والا نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود حدیثِ شفاعت میں حضرت نوحؑ کا قول مروی ہے کہ وہ کہیں گے کہ میں نے ایک ایسی دعا کردی تھی جس کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا، اس وجہ سے میں میدانِ حشر میں شفاعت کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ (امام ابن تیمیہؒ نے حضرت نوحؑ کی روایت کے جو الفاظ نقل کیے ہیں یعنی '' **إني دعوت على أهل الارض دعوة لم أومر بها** '' یہ الفاظ صحیحین میں موجود نہیں ہیں۔ البتہ حدیثِ شفاعت میں یہ واقعہ ضرور منقول ہوا ہے۔ دیکھیں: صحیح بخاریؒ: ۴۳۴۳۔ صحیح مسلمؒ: ۲۸۷) حالانکہ اگر مان لیا جائے کہ انہیں اس قسم کی بددعا کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا تو ایسا بھی نہ تھا کہ انہیں اس سے روک دیا گیا تھا۔ اگرچہ مقامِ نبوت کے شایانِ شان یہی تھا کہ وہی دعا مانگی جائے جو واجب یا مستحب کی حیثیت سے حکم فرمائی گئی ہے۔ یہاں جان رکھئے کہ دعا بھی عبادت ہے، اس لیے اس عبادت کو بھی مامور من اللہ قواعد وضوابط کے دائرہ یعنی وجوب واستحباب کے حدودِ اربعہ میں رہتے ہوئے ہی ادا کیا جانا چاہیے۔ بفرضِ محال مان بھی لیں کہ حضرت نوحؑ کو اس طرح کی بددعائیں کرنے کی اجازتِ خداوندی حاصل ہوگئی تھی، تب بھی یہ '' **شرع من قبلنا** '' (سابقہ شرائع) کے تحت آتا ہے جو کہ اسی وقت قابلِ قبول ہوتی ہیں جبکہ ان کا ہماری شریعت کے احکامات کے ساتھ کوئی تعارض واقع نہ ہوتا ہو۔ ذرا دیکھئے کہ آیا اس طرح کی بددعاؤں کا حکم ہماری شریعتِ اسلامیہ میں باقی ہے یا منسوخ ہوگیا ہے؟

کچھ یہی معاملہ حضرت موسیٰ کی بددعا کا بھی ہے جو قرآن میں اس طرح وارد ہوئی ہے: ﴿**وَقَالَ مُوسَى رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالاً فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّواْ عَن سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلاَ يُؤْمِنُواْ حَتَّى يَرَوُاْ الْعَذَابَ الأَلِيمَ**﴾ (یونس، ۸۸) ''موسیٰ نے دعا کی، اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے۔ اے رب، کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟ اے رب، ان کے مال غارت کردے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر کردے کہ ایمان نہ

لائیں جب تک کہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔''

اب اگر ہم نے دعا کو ایک عبادت کی حیثیت سے مان لیا ہے جو مستحب، واجب اور مباح ہوسکتی ہے، تو مذکورہ بالا بددعاؤں میں دیکھا یہی جائے گا کہ آیا یہ ہماری شریعت میں بھی علی حالہ باقی رکھی گئی ہیں یا منسوخ کردی گئی ہیں۔ شریعتِ اسلامیہ میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر دعا واجب و مستحب ہوتو دعا کرنے والے کو ثواب دیا جائے گا، اگر کسی حرام کے لیے ہو مثلاً ناحق خون بہانے کے لیے، یا حرام انداز میں غیراللہ سے کی جا رہی ہو تو ایسی دعا مانگنا گناہ اور معصیت کا عمل ہے، اور اگر دعا مکروہات سے متعلق ہو تو ایسی دعائیں کرنا داعی کے مقام و مرتبہ سے فروتر ہے، اور اگر دعا مباحات سے متعلق ہے تو اس میں دونوں پہلو برابر ہیں یعنی اس کے کرنے یا نہ کرنے پر کوئی شرعی مواخذہ نہیں ہوتا۔ اور اللہ سبحانہ تعالیٰ ہی سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔'' (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہؒ: ۸/ ۳۳۵)

معاصر علمائے کرام میں سے سعودی عرب میں کبارِ علماء بورڈ کے رکن شیخ صالح الفوزان کا کہنا ہے:
قنوتِ نازلہ وغیرہ دعاؤں میں صرف انہی کفار و مشرکین کے خلاف بددعائیں کرنا مشروع رکھا گیا ہے جو اہلِ اسلام پر ظلم و زیادتی کرتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بھی جب کفار و مشرکین کے مقابلہ قنوتِ نازلہ کا اہتمام کیا تھا تو اپنی دعاؤں میں مخصوص ایسے ہی کفار کا تذکرہ فرماتے تھے جو مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے، ایسا نہ تھا کہ جملہ کفار و مشرکین پر عمومی تباہی و عذاب کی بددعائیں فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی دعاؤں کے جو نمونے ہمیں احادیث میں ملتے ہیں وہ صاف صاف بتاتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مخصوص افراد اور متعینہ قبائل ہی پر بددعائیں فرمائی تھیں، سارے کفار کے حق میں ان بددعاؤں کو عام نہیں کیا تھا۔'' (مجلۃ الدعوۃ، العدد: ۱۸۶۹، ص ۲۶۰)

(۴) اگر کوئی کافر غیر حربی ہے یعنی ذمی ہے، مستامن ہے یا مسالم ہے تو اس کے خلاف بددعائیں کرنا یا اس کو لعنتِ خداوندی کا مستحق کہنا جائز نہیں، اس کے برعکس اُس کے لیے ہدایت و اصلاح کی دعائیں کرنا مناسب ہوتا ہے۔ مخالفینِ اسلام کے تئیں یہی سنت و سیرتِ رسول ﷺ ہمیں ملتی ہے۔ اسی لیے امام مہلبؒ فرماتے ہیں کہ: مشرکین پر بددعا کرنے کا حکم اختلافِ احوال میں مختلف ہوجاتا ہے۔ اگر کفار و مشرکین اسلام اور اہلِ اسلام کی حرمتوں کو پامال کریں اور بندگانِ خدا پر ظلم و ستم ڈھائیں تو ایسی صورت میں ان کے خلاف بددعائیں کرنا واجب ہوجاتا ہے۔ یہی حکم ظالم و جابر کفار و مشرکین کے ہم شاکلہ عاصیوں، فاجروں اور علی الاعلان گناہ کرنے والوں کا ہے۔ لیکن اگر دین اور اہلِ دین کی حرمتیں پامال نہیں ہو رہی ہیں، تو واجب ہے کہ غیر اہلِ ایمان کے لیے توبہ و انابت اور توفیقِ اسلام

کی دعا کی جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ آپ ﷺ سے درخواست کی گئی تھی کہ قبیلہ ’’دوس‘‘ پر عذاب کی بددعا فرمادیں لیکن آپ ﷺ نے جواب میں اُن کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی تھی۔ (اس حدیث کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے) علامہ ابن بطالؒ فرماتے ہیں: ہمیں سیرتِ پاک میں جو سبق ملتا ہے وہ یہی ہے کہ آپ ﷺ نے حالات کے تحت بسا اوقات کچھ لوگوں کے خلاف بددعا فرمائی تھی لیکن دوسرے کفار ومشرکین کے لیے ہمیشہ ہدایت کی دعا فرمائی۔ دونوں صورتوں میں نظر آنے والا اختلاف دراصل متعلقہ لوگوں کے جرائم وآثام کے اختلاف پر مبنی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ ایسے لوگوں پر ہلاکت کی بددعائیں فرماتے تھے جو اہلِ اسلام کو اذیت دینے میں انسانی حدود سے نکل کر حیوانیت میں داخل ہوجاتے تھے، لیکن جن افراد وقبائل کے تئیں رجوع الی الاسلام اور توبہ کی امید رہتی تھی، اُن کے لیے آپ ﷺ نے ہمیشہ ہدایت کی دعا ہی فرمائی ہے۔‘‘ (شرح صحیح مسلمؒ: ۱۱۲/۵)

۵) ایسی دعائیں مانگنا کہ صفحۂ ہستی سے سارے غیر مسلموں کا وجود ختم ہوجائے، نہ صرف ناجائز ہے، بلکہ گہری سرکشی ونافرمانی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ جو اس کائنات کا خالق ومالک اور مختارِ کُل ہے، اس نے دینِ حق اور متبعینِ حق کے پہلو بہ پہلو ادیانِ باطلہ اور پرستارانِ باطل کا وجود مقدر فرمایا ہے اور اُن کو باقی رکھنے میں اس کی حکمت کا دخل ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، جس حکم کا ارادہ کرتا ہے نافذ فرماتا ہے۔ اس لیے اس قسم کی دعا کرنا خدائی اسکیم سے بغاوت کے مرادف مانا جائے گا جو کہ ایک گناہِ عظیم ہے۔‘‘ (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والإفتاء: ۲۴/ ۲۷۵)

قارئین متوجہ ہوں!

(۱) مضامین کی کثرت کے سبب فکر وآگہی کا لم چند ماہ کے لیے موقوف کردیا گیا ہے۔

(۲) ترانہ جامعہ پر ڈاکٹر امتیاز وحید کا مضمون بعض وجوہ سے اس شمارے میں نہیں آسکا، آئندہ شمارے میں اس کی اگلی قسط ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) ’’ہمارے زمانے کا جامعہ‘‘ بعض وجود کی بنا پر اس شمارے میں بھی شامل نہیں کیا جاسکا۔

(۴) جامعہ میں تعطیل کے سبب اس شمارے میں ’’جامعہ کے لیل ونہار‘‘ کالم بھی شامل نہیں ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ سے یہ کالم بھی حسب سابق جاری رہے گا۔

مریم جمیلہ کے تہذیبی افکار

ضمیر الحسن خاں فلاحی، علی گڑھ، موبائیل نمبر: 07417449612

اسلامی تاریخ میں بیسویں صدی کو اس اعتبار سے امتیازی مقام حاصل ہے کہ اس میں جہاں اسلام اور اہل اسلام پر ہر طرف سے حملے ہوئے ہیں وہیں دوسری طرف کئی بڑی اسلامی تحریکات کی داغ بیل پڑی ہے، اور ان کے زیر اثر بہت سے متلاشیان حق کے لیے اسلام کی صاف وشفاف اور روشن شاہراہ کی طرف قدم بڑھانا آسان ہوا ہے۔

اس صدی کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں کئی مغربی دانشوروں نے اسلام کی آغوش میں پناہ لی جس میں عبدالکریم، ماڈریوک پکتھال، محمد اسد، مراد ہاف مین اور مریم جمیلہ جیسے نابغۂ روزگار مفکرین شامل ہیں، جنھوں نے اسلام قبول کر کے نہ صرف اسلامی تہذیب کا دفاع کیا بلکہ مغربی تہذیب کے تار و پود بکھیرنے اور اس کی بے ثباتی ثابت کرنے میں اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔

آج سے کوئی ۸۲؍ برس پہلے ۱۹۳۴ء میں امریکی ریاست نیویارک کے مضافات میں New Rochelle نامی شہر کے ایک یہودی گھرانے میں مارگریٹ مارکس نامی ایک بچی کی پیدائش ہوئی۔ اس کا خاندان اصلاً جرمن یہودی تھا مگر سالوں سے امریکہ میں مقیم تھا۔

مارگریٹ مارکس کو قدرت نے متلاشی، سنجیدہ اور حساس طبیعت ودیعت کی تھی چنانچہ دس سال کی عمر سے ہی اس نے مذہب میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور عربی تہذیب نیز عرب اور یہود کے درمیان تاریخی رشتہ سے متعلق مطالعہ شروع کر دیا۔ اسے یہ جان کر بڑا قلق ہوا کہ قوم یہود، اقوام عالم میں سب سے زیادہ مفاد پرست اور خود غرض ہے۔ اپنے مذکورہ مطالعہ سے متعلق اس نے ایک جگہ لکھا:

’’عربوں کی تاریخ اور تہذیب وتمدن سے متعلق پبلک لائبریریوں میں جس قدر کتابیں میسر آئیں، سب پڑھ ڈالیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے مجھے یقین ہوگیا کہ عربوں کے خلاف یہود کا پروپیگنڈہ سراسر جھوٹ اور ناانصافی پر مبنی ہے۔‘‘

(Maryam Jameelah, Islam and Orientalism. P-10)

مارگریٹ مارکس نے پندرہ سال کی عمر میں گریجویشن کی تکمیل کی اور ۱۹۵۳ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے نیویارک یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ وہ یہودیت سے پہلے ہی بدظن ہوچکی تھیں اور تلاش حق میں مسلسل سرگرداں تھیں۔ اس کے لیے مذاہب عالم کا مطالعہ جاری تھا کہ اس دوران، عین شباب میں وہ سخت بیمار ہوئیں اور بیماری بھی ایسی کہ محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ جاں بر نہیں ہوسکیں گی۔ اپنے اس اضطراب اور بے چینی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں: ''مجھے لگ رہا تھا کہ میں سمندر میں ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ میری اس حالت پر نہ اصلاح یافتہ بنیاد پرست یہودیت کو ترس آیا اور نہ ہی اتھیکل کلچر اور بہائیت نے میری تسکین کا کوئی سامان کیا''۔

(Maryam Jameelah, The story of one western converts..... P-91)

مگر رب کریم کو اس تن نازک سے بہت کچھ کام لینا تھا، اپنی اس شدید بیماری سے سنبھلنے کے بعد وہ نئے سرے سے مطالعہ مذاہب کی طرف متوجہ ہوئی اور اسلام کے مطالعہ کو اپنا مرکز توجہ بنالیا۔ اس ضمن میں انہوں نے مختلف تراجم قرآن کے ساتھ مغربی نومسلم، معروف مترجم قرآن محمد مرڈیوک پکتھال کا ترجمہ قرآن "The meaning of the Glorious Quraan" سے بھی استفادہ کیا۔ اس ترجمہ نے ان کی ذہنی الجھنوں کو سلجھایا اور بتدریج اسلام کی حقانیت اور آفاقیت ان پر منقح ہوتی چلی گئی۔ اس دوران انہیں ایک اور نومسلم مغربی دانشور محمد اسد کی کتاب "The Road to Mecca" کے مطالعہ کا موقع ملا، اس کتاب سے مارگریٹ بے حد متأثر ہوئیں۔ بقول ایک مفکر ''مارگریٹ کے مشرف بہ اسلام ہونے میں محمد اسد کی کتاب "The Road to Mecca" نے اہم رول ادا کیا ہے۔''

(Makers of Contemporary Islamic thought.P-56)

مارگریٹ نے اسی وقت سے کلمۂ شہادت پڑھنے کا مصمم ارادہ کرلیا، گرچہ اس کی تکمیل ۲۴ رمئی ۱۹۶۱ء کو عیدالاضحیٰ کے دن ہوئی، اور وہ مارگریٹ مارکس سے مریم جمیلہ ہوگئیں۔

قبول اسلام کے عملی اقدام سے پیشتر ۱۹۶۰ء میں مارگریٹ کا تعارف برصغیر میں احیائے اسلام کے داعی وعلمبردار سید مودودی سے ہوگیا تھا۔ مشرف بہ اسلام ہونے کے ٹھیک ایک سال بعد مئی ۱۹۶۲ء میں وہ ہجرت کرکے پاکستان آگئیں اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مصداق بن گئیں:

''وَمَن يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَماً كَثِيراً وَسَعَةً وَمَن يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ

مُهَاجِراً إِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ یُدْرِکْہُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُہُ عَلی اللّٰہِ"۔(النساء۔۱۰۰)

(جوکوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی کشادگی پائے گا۔اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے گا اور راستہ ہی میں اسے موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہوگیا۔)

اپنے قبول اسلام کے محرک کے حوالہ سے وہ رقمطراز ہیں:

"To me it meant a transformation for meribond and Parocial to a dynamic and revolutionary faith content with nothing less than universal supermacy."

(اسلام ایک نظریہ ایک تحریک۔ترجمہ آبادشاہ پوری،ص۔۲۰)

یعنی میں نے قریب المرگ اور محدود مذہب کو چھوڑ کر ایک ایسے حرکی، آفاقی اور انقلابی دین کو اختیار کیا ہے جو ہمہ گیر اور آفاقی اقتدار اعلیٰ سے کم تر کسی چیز پر قناعت نہیں کرتا۔

یوں تو کار ہجرت اپنے آپ میں ایک عظیم قربانی ہے جو اس اللہ کی نیک بندی نے عصر حاضر میں اسلام کی خاطر پیش کی، اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑا، گھر کی آسائشوں سے پر زندگی، زیب و زینت، ظاہری چمک دمک سے لیس مغربی تہذیب، مغربی فکر و عمل حتی کہ اپنے عزیز و اقارب کو بھی چھوڑ دیا اور مستقل طور پر پاکستان کی ہوکر رہ گئیں۔پاکستان ہی میں رہتے ہوئے ۳۰؍اکتوبر ۲۰۱۲ء کو ۷۸؍سال کی عمر میں وہ اس دار فانی سے رخصت ہوگئیں۔

مریم جمیلہ نے اسلام اور اسلامی تہذیب کو اپنا موضوع بنایا اور دنیائے مغرب کو اسلام کی حقانیت اور تہذیب اسلامی کی برتری سے روشناس کرایا، انہیں اسلام کی آفاقیت اور عالمگیریت پر پختہ یقین تھا، چنانچہ لکھتی ہیں:

''اسلام ایک آفاقی دین ہے، اس کا دروازہ تمام انسانیت کے لیے کھلا ہے۔''(اسلام ایک نظریہ ایک تحریک۔ترجمہ آبادشاہ پوری،ص۔۳۹)

تہذیب کسی بھی قوم کی شناخت اور پہچان ہوتی ہے اور ہر فرد بشر کسی نہ کسی تہذیب سے وابستگی پر فخر محسوس کرتا ہے، کیونکہ تہذیب کچھ مخصوص اصولوں پر کاربند ہوتی ہے۔لیکن مغربی تہذیب کے سلسلہ میں مریم جمیلہ کا خیال ہے کہ وہ اخلاق باختہ برائیوں میں ملوث ہوچکی ہے۔شہوت پرستی، بدکاری، ہم جنس پرستی، فریب کاری جیسی چیزیں مغربی تہذیب کی شناخت بن چکی ہیں۔اس کی اخلاقی قدریں ہر لحاظ سے کمزور اور

کھوکھلی ہوچکی ہیں۔اس پر طرفہ تماشا یہ کہ مغرب اپنی تہذیب کو اعلیٰ و برتر سمجھتا ہے اور اس زعم میں مبتلا ہے کہ اس کی تہذیب، دنیا کی دیگر تہذیبوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ بقول ایک مغربی اسکالر:

''مغرب کے پاس دو چیزیں ہیں۔شرم ناک جہالت اور اس سے زیادہ شرمناک احساس برتری۔''

(سہ ماہی مطالعات، خصوصی اشاعت ۲۰۱۰ء،ص۔۱۰۰، دہلی)

مریم جمیلہ نے ان وجوہات کا تجزیہ کیا ہے جن کی بنیاد پر مغرب اپنی تہذیب کو اعلیٰ و برتر باور کرتا ہے، وہ لکھتی ہیں:

''مغرب اپنے آپ کو سائنس اور ٹکنالوجی کا امام سمجھتا ہے جبکہ دوسری تہذیبیں اس کے نزدیک جاہل، سست اور غیر متحرک ہیں۔اس کے نزدیک ٹکنالوجی ہی سب کچھ ہے۔''

(Maryam Jameelah. Modern technology and dehuminization of man. P-68)

مریم جمیلہ کے خیال میں مغربی تہذیب سیکولرزم، یہودی روایات اور تاریخی قومیت کی پیداوار ہے۔مغربی تہذیب کی نقالی سے خبردار کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''جب تک ہم غیر ملکی تہذیب کی نقالی کے تباہ کن نتائج کا اعتراف کر کے اسے ختم کرنے کی ہر ممکن تدبیر نہیں کریں گے، قوت حیات سے بہرہ ور نہیں ہوسکتے۔اگر کسی شخص کا خیال ہے کہ مغربی لباس اور بود و باش کا انداز اختیار کرنے سے اجتناب قومی زندگی کے لیے فیصلہ کن اہمیت نہیں رکھتا تو اسے ہمارے مشہور مورخ ابن خلدون (۱۳۳۲-۱۴۰۶) کی مندرجہ ذیل رائے پر غور کرنا چاہیے۔

''مفتوح اقوام ہمیشہ فاتح قوموں کے لباس، امتیازی نشان، رسم و رواج اور معلومات کی اتباع کی خواہش مند ہوتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ ان لوگوں کو بہترین اور کامل نمونہ سمجھتے ہیں جو انہیں شکست دے کر محکوم و مطیع بنا لیتے ہیں۔فاتحین کی عظمت و عزت ان کے دلوں میں گھر کر جاتی ہے۔یہی جذبۂ احترام انہیں ان فاتحین کے رنگ اختیار کرنے پر مائل کرتا ہے یا پھر وہ اپنی شکست کے حقیقی اسباب وعوامل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ ان فاتحین کی کامرانی کا سبب ان کی انتہائی کاملیت ہے۔ایک لمبا عرصہ گزرنے پر یہ یقین گہری جڑیں پکڑ لیتا ہے چنانچہ وہ فاتحین کے طور اطوار اور عادات وخصائل کی نقالی کرنے لگتے ہیں۔یہ نقالی غیر شعوری طور پر بھی کی جاسکتی ہے اور اس غلط اعتقاد کی بنا پر بھی کہ فاتحین کی فتحیابی ان کی برتر عصبیت، قومی استحکام اور جسمانی قوت کی بنا پر نہ تھی بلکہ مفتوح قوم کے رسم و رواج اور کمتر عقائد اس کے ذمہ دار تھے۔وہ اس خیال خام میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ

اس طرح نقالی کر کے شکست کے اسباب وعوامل کا ازالہ ہو جائے گا۔ درحقیقت ہر وہ ملک جس کے پڑوسی زورآور فاتح ہوتے ہیں، اپنے ان پڑوسیوں کی نقالی کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ ہم اسپین کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں، وہ لباس اور زیب وزینت وغیرہ میں اپنے عیسائی پڑوسیوں کی نقالی کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ ان کے گھروں اور دکانوں میں مجسمے اور تصویریں تک موجود ہیں۔ نگاہ غائر سے دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ لوگ احساس کمتری میں مبتلا ہو چکے ہیں۔'' (مریم جمیلہ: اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، ص۔۱۲-۱۱۱)

مذکورہ اقتباس میں امام ابن خلدون نے ایک عبقری جیسی بصیرت کے ساتھ اس مرض کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر دی ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔

مریم جمیلہ عالم اسلام میں مغربی فکر وتہذیب کے اثرات پر ہمیشہ نوحہ کناں رہیں کیونکہ وہ اس کو اسلامی تہذیب کے لیے خطرہ سمجھتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے مادیت پر مبنی ہر نظریہ پر تنقید کی، روم وایران کے فکر وتہذیب کی دھجیاں بکھیر دیں۔ مغربی فکر وفلسفہ اور تہذیب کا تنقیدی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی فکر وتہذیب کو متبادل کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جس بات کو حق جانا، برملا اس کا اظہار کیا اور جس چیز کو غلط جانا اسے ڈنکے کی چوٹ پر غلط کہا۔ ان کے نزدیک اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے کیونکہ وہ ان تمام خصوصیات سے متصف ہے جو حیات انسانی کی تکمیل، تہذیب، تعمیر، تنزیہ اور اسے حقیقی امن وسکون فراہم کر سکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ اسلام ایک مستقل تہذیب بھی ہے، ایک ایسی تہذیب جس کی وسعتیں زمان ومکان کے حدود سے آزاد ہیں۔

تہذیب اسلامی چونکہ بنیادی طور پر اللہ کی وحدانیت کے اقرار، رسولؐ کے اسوہ حسنہ اور آخرت کی جواب دہی کے احساس پر مبنی ہے، اس لیے عدل وانصاف، اخوت ومساوات اور فرد ومعاشرہ کی فکری وروحانی تربیت اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ مریم جمیلہ کے نزدیک عمل کا دارومدار انسان کے عقائد پر ہے، اس لحاظ سے دنیا کی کوئی تہذیب، اسلامی تہذیب کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

الغرض مریم جمیلہ نے مغربی تہذیب کا ہمہ پہلو جائزہ لے کر اس کے کھوکھلے پن کو نمایاں کیا اور اسلامی تہذیب کی برتری کو واشگاف انداز میں ثابت کیا۔ بیسویں صدی اس اعتبار سے بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے آغاز سے ہی پوری دنیا نے اسلامی فکر وتہذیب کو ہدف تنقید بنایا اور ہر طرح کے ذرائع استعمال کر کے پورے عالم اسلام میں اپنے اثرات پھیلانے کی کوشش کی جو اَب بھی جاری ہے۔

مریم جمیلہ مسلم اہل فکر ودانش کو متوجہ کرتی ہیں کہ وہ تمام فلسفوں کو رد کر دیں جو وحی وتنزیل کی

صداقت کے منکر اور فکری آزادی کے نام پر ریب وتشکیک کو نیکی کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ اور اس کے نازل کردہ ناقابل تغیر قانون کی مکمل پیروی ہی دنیا میں امن وسکون کی ضامن ہے۔'' (مریم جمیلہ۔ اسلام ایک نظریہ ایک تحریک۔ ص۔ ۲۹۶)

مریم جمیلہ کی تقریباً تین درجن تصنیفات ہیں جن میں بیشتر مغربی تہذیب کی تنقید پر مشتمل ہیں۔ ان میں درج ذیل خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مغربی تہذیب کو سمجھنے اور اسلامی ومغربی تہذیب کے موازنہ کے ضمن میں ان کا مطالعہ نہایت مفید اور معاون رہے گا۔

(1) Islam verses the west (2) Islam in theory and Practice (3) Western civilization condemned by it self (4) Is western civilization Universal?

خلاصہ بحث یہ کہ مریم جمیلہ کے نزدیک مسلمان ہونے کے تقاضے عبادات کی پابندی سے کہیں زیادہ ہیں۔ جب تک ایک مسلمان کا ذہنی، اخلاقی اور روحانی نقطہ نظر نہ بدل جائے، عبادات کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اپنی کتاب "Islm in theory and Practice" (اسلام ایک نظریہ، ایک تحریک) میں وہ رقمطراز ہیں:

''اسلام کا بنیادی عقیدہ وتصور یہ ہے کہ انسان اللہ کا بندہ ہے، اسلام کے حقیقی معنی ہیں اللہ کی مرضی کے آگے جھک جانا، اسلامی حکومت کا مقصد اللہ کے قانون کا نفاذ ہے، مسلمان حکمراں نہ تو خود قانون کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے نہ وہ اپنے طور پر کوئی قانون بنانے کا حق رکھتا ہے۔ شریعت الٰہی کو کبھی بدلا نہیں جا سکتا۔ ہاں اس کی تعبیر کی جا سکتی ہے۔ ہر چیز کا مالک اللہ ہے، انسان کی اپنی کوئی چیز نہیں ہے وہ کلیۃً اللہ کا دست نگر ہے۔ اللہ کا بندہ ہونے کا مطلب انسانوں کے جور واستبداد سے آزادی ہے۔ سچا مسلمان کسی انسان سے نہیں ڈرتا، وہ صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔ کسی شخص کی نسل، قومیت، دولت یا معاشرتی حیثیت کا اس کے حقیقی انسانی وصف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' (اسلام ایک نظریہ، ایک تحریک۔ ص۔ ۳۸)

ظاہر ہے اس تصور وعقیدہ کے ساتھ جو تہذیب اور جو تمدن پروان چڑھے گا، وہ ظلم وجور سے کلیۃً پاک ہوگا، وہ کسی کے خلاف جارحانہ اقدامات کا روادار نہ ہوگا، اس کے یہاں کسی طرح کا بھید بھاؤ، تعصب اور تنگ نظری نہ ہوگی، وہ ہمیشہ ایک صحت مند معاشرہ کی تشکیل وتعمیر کے لیے کوشاں نظر آئے گا۔

فرضِ محبت کا شاعر
حفیظ میرٹھی

سید راشد حامدی فلاحی، نئی دہلی

حفیظ میرٹھی نے بازارِ شعروادب میں جب اپنی دکان کھولی تو حآلی کی طرح ان کی دکان ہی سب سے الگ نہیں تھی بلکہ ان کا مال بھی سب سے الگ اور نایاب تھا۔حالی نے یہ کہہ کر کہ ''شہر میں حآلی نے کھولی ہے دکاں سب سے الگ'' اپنے شعری موقف کے انفراد کو واضح تو کر دیا تھا لیکن اس وضاحت کے باوجود اس میں ابہام بہرحال پایا جاتا تھا، جسے دور کرنا شاید انہوں نے ضروری نہیں سمجھا۔مگر جب حفیؔظ نے اپنے شعری موقف کا اعلان کیا تو لوگوں پر یہ بات پوری طور پر واضح کر دی کہ ان کی دکانِ شاعری ہی سب سے الگ نہیں بلکہ ان کا شعری موقف بھی سب سے الگ اور نایاب ہے جس کی تفہیم میں کوئی ابہام ہے نہ کوئی اشکال۔

رعنائی افکار وخیالات کا مطلب
عریانیٔ افکار وخیالات نہیں ہے

حفیؔظ جو سودا بازار میں لے کر آئے تھے وہ اسلامی اخلاق واقدار اور مشرقی تہذیب وروایات کی کسوٹی پر پرکھا ہوا ۲۴؍ کیرٹ کا زرِ خالص تھا، کھرا اور ملاوٹ سے پاک، جو درآمد شدہ تھا نہ اس پر کوئی غیر ملکی مہر تھی۔وہ پورے کا پورا مشرقی بلکہ صحیح تر الفاظ میں اسلامی تھا جس پر ہندوستانیت کا Hologram صاف نظر آتا تھا۔

حفیظ میرٹھی نے صالح اقدار اور اسلامی فکر وفلسفہ پر مبنی غزل کا اعلان ایسے وقت میں کیا جب برصغیر ہندوپاک کی پوری ادبی اور شعری فضا ترقی پسندی کے جبری استبداد اور خودساختہ فکری جکڑ بندیوں کا شکار تھی۔جسمانی اور ذہنی لذت اندوزی کے لیے شعروادب کی پاکیزہ روایات کو سرِ بازار عریاں کیا جا رہا تھا اور شعروادب میں صالح قدروں اور پاکیزہ روایتوں کے حامی وعلمبردار خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ حفیظ میرٹھی نے اس وقت غزل کے آہنگ میں صدائے لاالٰہ بلند کی تو ادباء وشعراء اور ناقدین فکر وفن نے

اپنے ہوش و گوش کے دروازے بند کر لیے کہ کہیں یہ دیوانہ ''کافر غزل'' کو مسلمان نہ کر دے مگر حفیظؔ نے غزل اس سوز سے گائی کہ لوگوں کے دل گداز ہوا ٹھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ناقدین نے اس شکست دل کی آواز کو سنی اَن سنی کر دیا۔ مگر آج یہ بات پورے وثوق اور تیقن کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اقبال اور اکبر الہ آبادی کے بعد سب سے زیادہ اشعار جس شاعر کے سنے، پڑھے اور نقل کئے جاتے ہیں اس کا نام حفیظ میرٹھی ہے۔ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت نے مصنوعی دانش وروں اور فنکاروں کی جو باڑھ لگا رکھی ہے وہ سامنے سے ہٹے تب لوگوں کو احساس ہوگا کہ ان کی نگاہوں کو جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری نے خیرہ کر رکھا تھا۔ حفیظ میرٹھی کو تو چھوڑ یئے ان نام نہاد ناقدین اور مصنوعی دانش وروں نے اقبال کا بھی حق ادا نہیں کیا جبکہ اردو دنیا اس جیسا شاعر تو کجا اس کا اڈھا پونا بھی آج تک پیدا نہیں کر سکی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ اسلامی فکر کے علمبردار ہیں اور ملت اسلامیہ کی سرفرازی اور اس کی نشأۃ ثانیہ ان کی شاعری کا ہی نہیں ان کی زندگی کا بھی مرکز و محور ہے۔

اس دوران غزل وؔلی دکنی، میرؔ و غالبؔ، ذوقؔ و داغؔ، حسرتؔ و جگرؔ اور حالؔی و اقبالؔ کی فنی اور شعری وراثتوں سے استفادہ کرتی اور اپنوں اور غیروں کی سازشوں کے جال توڑتی بیسویں صدی کے وسط میں اس نورانی پیکر اور پاکیزہ ہالے تک آ پہنچی جسے دنیا حفیظ میرٹھی کے نام سے جانتی ہے، جس نے اپنے سوزِ دروں سے غزل کو ایک نیا آہنگ عطا کیا۔ جس نے حالی و شبلی اور اقبال و اکبر کی فکری و شعری وراثت کو مستعار لے کر غزل کا نیا لفظیاتی اور معنیاتی نظام وضع کیا۔ حفیظ کی لفظیات Diction الگ ہو سکتی ہیں مگر ان کی غزلیہ شاعری کا فکری اور معنوی نظام وہی ہے جس کی وکالت حالی و شبلی نے کی تھی اور جسے علامہ اقبال نے اسلامی فکر و فلسفہ اور ملت اسلامیہ کے تاریخی و تہذیبی ورثہ کو غزل نما نظم اور نظم نما غزل میں معراج کمال تک پہنچایا تھا۔ حفیظ میرٹھی نے ترقی پسندی کی اشتہاریت، جدیدیت کی بے سر و پائیت اور مابعد جدیدیت کی پراسراریت کے بالمقابل اپنی غزلیہ شاعری کو غزل کی بلند ترین سطح پر آئینہ کی طرح اس طرح آویزاں کیا جس سے غزل کے نئے رنگ و نور ہی منعکس نہیں ہوئے بلکہ اس میں صالح قدروں کا تقدس بھی تھا اور موجودہ سماجی اور عصری منظر نامہ بھی۔ چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

کتنے اہلِ ہوش کس کس طرح بہکانے اٹھے
آپ کے کوچے سے اٹھنے تھے نہ دیوانے اٹھے
آج کی بدحال دنیا کے بھی دن پھر جائیں گے
اے مؤرخ! ہم اگر تاریخ دہرانے اٹھے

ہمارا ہی جگر ہے یہ ہمارا ہی کلیجہ ہے
ہم اپنے زخم رکھتے ہیں نمک دانوں سے وابستہ
نہ لے چل خانقاہوں کی طرف شیخِ حرم مجھ کو
مجاہد کا تو مستقبل ہے میدانوں سے وابستہ
میں یوں رہزن کے بدلے پاسباں پر وار کرتا ہوں
مرے گھر کی تباہی ہے نگہبانوں سے وابستہ
مؤرخ تیری رنگ آمیزیاں تو خوب ہیں لیکن
کہیں تاریخ ہوجائے نہ افسانوں سے وابستہ
حفیظِ میرٹھی کو کون پہچانے کہ بے چارہ
نہ ایوانوں سے وابستہ نہ دربانوں سے وابستہ

سوز میں ڈوبی ہوئی نغمگی، موسیقیت بکھیرتے ہوئے الفاظ، خلوص وصداقت سے لبریز خیالات، حیات وکائنات کے ساز سے ہم آہنگ دھیما اور پرسوز آہنگ، حفیظ کی غزلیں نہیں سچائی، صداقت، روشنی اور زندگی سے بھرپور نغمے ہیں جسے گنگناتے گنگناتے آدمی عالم خیال میں آفریدہ کائنات سے ناآفریدہ کائنات میں پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا وجود اپنی معنویت کھودیتا ہے اور یہاں پہنچ کر اس کا رشتہ اس عظیم مقصدیت سے استوار ہوجاتا جسے وجہ تخلیق کائنات کہا جاتا ہے۔ حفیظ کے نغمے ہمیں موسیقی کی طرح بیٹھے بیٹھے جسمانی تحرک پر آمادہ نہیں کرتے بلکہ ان کے نغمے راہِ شوق میں قدم آگے بڑھانے پر مجبور کرتے ہیں، وہ انسان کو انسانیت کا درس دیتے ہیں، سچ بولنے اور سچائی کا ساتھ دینے کی ترغیب دیتے ہیں، وہ زندگی کے ہر میدان میں طاغوتی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں، وہ حق وصداقت کا علم اٹھانے اور ظلم وجبر کے بالمقابل ہتھیار ڈالنے کے بجائے ان کے خلاف ڈٹ جانے اور مزاحمت کرنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

کہاں یہ سطح پسندی ادب کو لے آئی
جہاں نظر کی بلندی نہ دل کی گہرائی
ہزار حیف کہ ہم تیرے بے وفا ٹھہرے
ہزار شکر کہ ہم کو وفا نہ راس آئی
حیات پوچھ رہی تھی سکون کا مفہوم
تڑپ کے دل نے ترے درد کی قسم کھائی

حفیظ میرٹھی کے کلام میں جو سماجی اور تہذیبی شعور پایا جاتا ہے وہ خالص اسلامی ہے اور یہ شعور اس قدر پختہ اور بالیدہ ہے کہ اس میں کسی اور رنگ کی آمیزش اور آویزش ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ وہ شعر وادب میں سطحیت پسندی کو پسند نہیں کرتے بلکہ وہ شعر وادب میں نظر کی بلندی اور دل کی گہرائی کے خواہاں ہیں۔ ان کی غزلوں میں ہوس چور دروازوں سے بھی داخل ہونے سے کتراتی ہے۔ ان کی غزلوں میں فکر ونظر کی پاکیزگی بھی ہے اور اپنے وجود کا گہرا شعور اور اس سے مکمل وابستگی بھی۔

حفیظ کا شعور تصوف سے لگا کھاتا ہے نہ طریقت سے، نہ ان کے کلام میں ایسی سرمستی اور رندی ہے جو انہیں مقامِ عبودیت سے بے گانہ کر دے۔ ان کے کلام میں روحِ عصر بھی ہے اور روحانیت بھی، لیکن ایسی روحانیت نہیں جو انہیں خودفراموشی سے خدافراموشی کی طرف لے جاتی ہے۔ نہ ان کے کلام میں اس نام نہاد مشترکہ تہذیبی ورثہ کا کہیں ذکر یا نام ونشان ہے جس کا ان کے دور میں بڑے زور وشور سے ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا۔ نہ انہوں نے رواداری اور ہندو مسلم اتحاد کی ترنگ میں مشرکانہ ترانے گائے۔

حفیظ میرٹھی اپنے ہم عصروں ہی میں نہیں اپنے پیش رووں میں بھی اس وجہ سے انفراد کے حامل ہیں کہ ان کے کلام میں حالی وشبلی، اقبال وفیض اور دوسرے جدید شعراء کی طرح ورڈزورتھ، شیلے، کیٹس، براؤننگ اور ٹینی سن کے خیالات یا دوسرے مغربی مفکرین کی اثر اندازی بالکل نظر نہیں آتی، نہ وہ ان کے خیالات سے متاثر ہیں نہ ان کی اصطلاحوں کو جا بجا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں مشرق کا سماجی شعور اور مشرق کا تہذیبی فہم اس قدر خالص اور پختہ ہے کہ اس معاملے میں ان کے پیش رو اور ہم عصر شعراء ان سے میلوں پیچھے نظر آتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں نصب العین اور مقصدیت کے تعلق سے جو واضح شعور ملتا ہے ان کے بعد اس کی واضح ترین مثال حفیظ کے کلام میں نظر آتی ہے۔ حالانکہ ناقدین نے حالی اور اقبال کے بعد سب سے زیادہ واضح نصب العین کا شاعر فیض کو قرار دیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ ناقدین نے یہاں اقبال کی عظمت کو تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ نصب العین اور مقصدیت کا حوالہ دے کر فیض کے قد کو بڑھانے کی سعی کی ہے۔ صحیح بات یہ ہے، جس سے ہر انصاف پسند اتفاق کرے گا کہ اقبال کے نصب العین اور فیض کے نصب العین میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ فیض کی خرابی یہ ہے کہ ان کا نصب العین سراسر اشتراکی ہے جس کا ہندوستان کے مشرقی ورثہ سے کوئی تعلق ہے نہ وہ اس حد تک مربوط ہے کہ اسے زندگی کا نصب العین قرار دیا جا سکے۔ فیض کے یہاں شعر وادب میں نصب العین اور مقصدیت کے تئیں وابستگی تو چھوڑیئے ان کے یہاں تہذیب کا ہی کوئی واضح تصور نہیں ملتا۔ جب کہ اقبال کے یہاں یہ تصور بہت واضح ہے بلکہ ان کے کلام میں سب سے زیادہ ابھری ہوئی حقیقت بھی یہی ہے جس سے کوئی انکار نہیں

کر سکتا۔ آپ فیض کا پورا کلام پڑھ جایئے، آپ یہ نہیں بتا پائیں گے کہ وہ قوم کو یا انسانیت کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں۔ چند خوش نما نعروں اور چند حسین و دل فریب دعووں کے ماسوا ان کے یہاں کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ناقدین اس حقیقت کو دانستہ طور پر پس پشت ڈال دیتے ہیں کہ فیض کی جو تھوڑی بہت مقبولیت ہے وہ ان کی اشتراکیت پر مبنی اشتہاری نظموں سے نہیں بلکہ ان کے اس غزلیہ اسلوب کی بنا پر ہے جس میں نصب العین اور مقصدیت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

میں یہ بات تو کسی درجہ میں شاید تسلیم کرلوں کہ فیض کی جمالیات مشرقی ہیں مگر یہ بات میں ہرگز نہیں مان سکتا کہ ان کا نصب العین اور ان کے مقاصد بھی مشرقی ہیں۔ یہ بات میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا نصب العین درآمد شدہ ہے۔ اس کا مشرق اور مشرقی اقدار سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری کا آہنگ مشرقی ہوتے ہوئے بھی مشرقی نہیں ہے بلکہ اس میں سرخ انقلاب اور سرخ سویرے کی آمیزش ہے جس کا اردو ادب کی تاریخی روایات سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

نصب العین اور مقصدیت میں ہم آہنگی اور فکری و معنوی شعور کی پختگی کے تناظر میں دیکھا جائے تو اقبال کے بعد حفیظ کو سب سے زیادہ واضح نصب العین کے شاعر کی حیثیت دینی ہوگی کیونکہ ان کا محبوب نہ ایرانی ہے نہ مغربی بلکہ ان کا محبوب سرتاپا اسلامی و مشرقی ہے۔ انہوں نے مارکس اور لینن سے کوئی استفادہ کیا ہے نہ ورڈز ورتھ اور کیٹس سے۔ جو بھی ہے وہ ان کا اپنا ہے، مشرق کا ہے، اسی سرزمین کا ہے جہاں غزل نے اپنی آنکھ کھولی اور جہاں کی مٹی کی خوشبو اس کے سراپے میں بسی ہوئی ہے۔

فیض کا المیہ یہ ہے کہ وہ شعوری طور پر ترقی پسند ہیں جبکہ فطرتاً وہ مشرقی ہیں۔ شعور انہیں کرافٹ پر مجبور کرتا ہے جبکہ فطرت انہیں فن کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ اس صورت میں جب کرافٹ اور فن کے درمیان تصادم ہوتا ہے تو اس کے نتیجہ میں ان کی شاعری ملغوبہ بن کر رہ جاتی ہے۔ کہیں استعاروں کا خون ہوتا ہے تو کہیں تراکیب اوندھے منہ گر جاتی ہیں۔ کہیں الفاظ و معانی منہ پھیر کر کھڑے ہوجاتے ہیں تو کہیں معنویتیں اور کیفیتیں آپس میں خلط ملط ہوجاتی ہیں، کہیں الفاظ سر اٹھانے لگتے ہیں تو کہیں خیال منہ چڑانے لگتا ہے۔ فیض پوری زندگی اس کشمکش سے نہیں نکل پائے۔ کچھ ناقدین انہیں اس وجہ سے اقبال کا فکری وارث قرار دیتے ہیں کہ انہیں فیض کے کلام میں حق پرستی اور ظلم و ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بہت واشگاف انداز میں سنائی دیتی ہے جو سراسر غلط ہے۔ فیض کے یہاں حق پرستی نہیں لینن پرستی اور مارکسیت ہے جو ایک مخصوص طرزِ فکر کی دعوت دیتی نظر آتی ہے۔ حفیظ میرٹھی اس قسم کے تضادات کا شکار نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے شعری اظہار میں جو وضع اور طرزِ سخن اختیار کیا ہے اس میں

کہیں بھی جھول اور تضاد نہیں ہے۔ انہوں نے روایتی شعری اصطلاحوں کو اشعار میں اس طرح برتا ہے کہ بسااوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اصطلاح خود ان کی وضع کردہ ہے کیونکہ ان کے یقین، فکر اور جذبے کی روشنی ان کے اشعار میں ہراول دستے کی طرح ان کے آگے آگے چلتی نظر آتی ہے۔ حفیظ کے اشعار اشعار نہیں تاریخی اور تہذیبی ورثہ کی عکسی تصاویر ہیں جو شعر کی قرأت کے ساتھ ساتھ دل و دماغ پر مرتسم ہوتی جاتی ہیں۔ ان کے شعری تجربے اور فکری زاویے اتنے توانا اور جاندار ہیں کہ قاری شعور اور لاشعور کی درمیانی کیفیت میں خود کو اس کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ بعض شعراء کا حال یہ ہے کہ ان کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت الفاظ اور موضوع اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ سر پیر بن جاتے ہیں اور پیر سر۔ ایسا بالعموم اس وقت ہوتا ہے جب موضوع پیچھے رہ جاتا ہے اور الفاظ آگے آجاتے ہیں۔ الفاظ معانی کو وسعت دینے کے بجائے اپنی اہمیت اور اپنا آپا منوانے لگتے ہیں لیکن حفیظ کا کلام اس مرض سے پاک اور منزہ ہے۔ ان کے کلام میں الفاظ مفہوم و معانی کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے ہیں۔ موضوع کی معنی خیزی الفاظ کی قسمت ہی نہیں ان کی عاقبت بھی سنوار دیتی ہے۔ ان کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ معانی الفاظ و تراکیب میں گم نہیں ہوتے بلکہ معانی کی وسعت پذیری کا سبب بنتے ہیں۔ اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ ان کے کلام میں عرفانی، وجدانی اور مقصدی پہلو لفظی اور معنوی دونوں سطحوں پر حاوی نظر آتا ہے، چونکہ ان کا راست تعلق جذبے سے ہے اس لیے جذبہ خود بولتا ہے وہاں الفاظ کا مرتبہ ثانوی ہو جاتا ہے۔ یہ خوبی کلام اقبال کے بعد صرف حفیظ میرٹھی میں نظر آتی ہے۔

حفیظ کی تعیین قدر کرتے وقت ہمیں اس نکتہ کو بہر حال ذہن میں رکھنا ہوگا کہ حالی و شبلی اور اقبال کی طرح حفیظ شعر و ادب میں صالح اقدار اور مشرق کے پاکیزہ تہذیبی سرمایے کے علمبردار ہیں۔ یہ حفیظ میرٹھی کی نہیں بلکہ اس دور کے ناقدین کی بدقسمتی ہے کہ انہوں نے حفیظ کے فن اور پیغام کو کم اور ان کے اس اعلان کو زیادہ اہمیت دی کہ وہ شعر و ادب میں صالح اقدار کے حامی و علمبردار ہیں۔ یہ نظریہ چونکہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے بالکل برعکس تھا اور حفیظ کے اس لافانی نظریے سے ان کے باطل اور غیر فطری نظریے پر ضرب پڑتی تھی اس لیے انہوں نے حفیظ کو شعوری طور پر نظرانداز کر کے انہیں ''ادب بدر'' اور ''زندہ درگور'' کرنے کی کوشش کی۔ حفیظ چونکہ اپنے پیغام کی معنویت اور اس کی اہمیت سے واقف تھے اس لیے انہیں اس بات کا بھی شعور تھا کہ باطل نظریات کبھی بھی ان کی اس جرأتِ رندانہ بلکہ جرأتِ مومنانہ کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کریں گے۔ اس شعور نے انہیں چوٹ کھا کر مسکرانے اور زخم کھا کر دعائیں دینے کا ہنر دیا جس نے ان کے کلام کو شگفتہ اور جاذبِ نظر ہی نہیں مؤثر و دل پذیر بھی بنا دیا۔

گلوں سے داغ کانٹوں سے خلش لینے کو آئے ہیں
گلستاں میں ہم اپنے دل کو بہلانے نہیں آئے

غزل میں یہ اندازِ فکر صرف حفیظ میرٹھی کی دین ہے۔ یہ خیال آفرینی نہیں اسلامی تصورِ حیات کی ترجمانی ہے جسے حفیظ نے اپنے فن سے غزل بنا دیا۔ وہ دنیا میں دل بہلانے یا بے مقصد لطف اندوزی کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ اس کی پشت پر ایک عظیم الشان مقصد کارفرما ہے۔ لالہ وگل انہیں اس لیے عزیز نہیں ہیں کہ وہ اس کے رنگ وروپ اور خوشبو سے مشامِ جاں کو معطر کریں بلکہ وہ اس لالہ وگل سے دل کا داغ اور کانٹوں سے خلش پیدا کرنے کا کام لیتے ہیں۔ وہ اس دنیائے بے ثبات میں، اس گلستانِ آب وگل میں دل بہلانے نہیں بلکہ ایک خاص مقصد سے آئے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مقصد آخر کیا ہے اور گلوں سے داغ اور کانٹوں سے خلش لینے کا مفہوم کیا ہے؟ اگر آپ حفیظ میرٹھی کے صحیفۂ دل کی تلاوت کریں تو آپ کو اس کا شافی وکافی اور تسلی بخش جواب خود بخود مل جائے گا۔ وہ مقصد ہے اعلائے کلمۃ اللہ، ان کی پوری شاعری اسی کے گرد طواف کرتی نظر آتی ہے، وہ اس عالم ہستی کا نظام اہل ظرف کے ہاتھوں میں دینا چاہتے ہیں، وہ دنیا کو چیتاونی دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ابھی کیا ہے کل اک اک بوند کو ترسے گا میخانہ
جو اہل ظرف کے ہاتھوں میں پیمانے نہیں آئے

وہ انسان کو انسان بنانا چاہتے ہیں، وہ انسان کو خدا کی مرضی کے تابع کر دینا چاہتے ہیں، وہ انسان کو ظلمت سے نکال کر روشنی کی طرف لانا چاہتے ہیں، وہ دنیا کو نام نہاد خداؤں کے وضع کردہ مصنوعی اور خلافِ فطرت نظاموں کے ظالمانہ پنجوں سے نکال کر اسلام کے نظامِ عدل سے روشناس کرانا چاہتے ہیں اور گلوں سے داغ اور کانٹوں سے خلش لے کر ان کے دل میں اس عالم ہستی کو سنوارنے اور نکھارنے کی تڑپ، کسک اور خلش پیدا کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس کے لیے لوگوں کو بیدار رکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں صرف اپنے آشیاں اور اپنے گلستاں کی فکر نہیں ہے بلکہ ان کا دل پوری بنی نوعِ انساں کے لیے تڑپتا ہے، وہ اپنی اس بات کو ایک دوسرے شعر میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ کہتے ہیں ؎

ہیچ ہیں میری نظر میں آشیان و گلستاں
آدمی ہوں عزمِ تعمیرِ جہاں رکھتا ہوں میں

حفیظ کی تعیین قدر اور ان کے اشعار کی تفہیم کے لیے ان کے کلام کی پڑھت نہیں پرکھ کی ضرورت ہے۔ حفیظ کو کہیں سے بھی پڑھیے، کسی غزل کو بھی اٹھائیے، اسے کسی بھی رخ سے جانچئے اور پرکھئے آپ کو

اندازہ ہوگا کہ ان کا کلام یکسوئیت سے بھر پور ہے۔جس طرح آلۂ قبلہ نما کو کتنی بھی حرکت دیجئے اس کی سوئی جبری تحریک سے آزاد ہوتے ہی قبلہ کی طرف ہی اشارہ کرے گی۔حفیظ کے کلام کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں یکسوئیت کے باوجود یک رخا پن نہیں ہے۔ان کے اشعار مختلف الجہات Multi-Dimention ہیں جو قطرہ میں دجلہ کی کیفیت رکھتے ہیں۔حفیظ غزل میں بدنی جمالیات کے نہیں فکری اور معنوی جمالیات کے قائل ہیں۔دوسرے الفاظ میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ حفیظ کی جمالیات سراسر اسلامی اور مذہبی ہیں۔اس سلسلے میں ان کا نظریہ بالکل واضح اور غیر مبہم ہے کہ احساسِ جمال کی تسکین کے لیے عریاں نگاری اور گناہ کی ترغیب دینے والی کیفیات ضروری نہیں ہیں، بلکہ وہ شعر وادب میں صالح فکر اور صالح اقدار کو اہمیت دیتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے اپنے اس نظریہ کو بہت وضاحت کے ساتھ شعر میں پیش کیا ہے کہ

رعنائی افکار وخیالات کا مطلب　　　عریانیٔ افکار وخیالات نہیں ہے

لیکن حفیظ کے اس نظریۂ شاعری کو سمجھنے کے لیے پہلے ذہن ودل سے اس غلط فہمی کو نکالنا ہوگا کہ مقصدیت سے غزل میں تغزل نہیں رہتا اور غزل بے جان اور سپاٹ ہو جاتی ہے۔دراصل اس فکر کے ڈانڈے ترقی پسندی کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے ملتے ہیں کہ شاعری کسی نظریے(Ism) عقیدے (Faith) اور مذہب(Religon) کی پابند نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت آفاقی ہوتی ہے۔حالانکہ شعر وادب میں اس نظریہ کے قائلین بھی کسی فکر کے قائل ہونے کی بنا پر ہی شعر وادب کو عقیدے اور مذہب سے دور رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔یہ نظریہ دراصل بے خدا تہذیب اور مذہب دشمنی کی کوکھ سے نکلا ہے۔جسے وہ خود ایک تہذیب، کلچر اور نظام حیات قرار دیتے ہیں۔اور اسے پوری دنیا پر تھوپنا چاہتے ہیں۔جبکہ یہ نظریہ سراسر غلط ہے اور فنون لطیفہ بالخصوص اردو شعر وادب کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔شعر وادب دراصل انسانی جذبات واحساسات کے ترجمان ہوتے ہیں۔وہ عہد کے حقائق اور کائنات کی ازلی سچائیوں کو اجاگر کرتے ہیں، لیکن جذبات واحساسات ہوا میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ شاعر کا تشخص اور اس کا کردار اس کے ظاہر وباطن سمیت اس کے جملہ مذہبی اعتقادات اور روحانی تصرفات کے ساتھ اس کے فکر وفن اور اس کے شعر وادب میں پورے طور پر ملوث ہوتا ہے۔اگر وہ مذہبی بے یقینی، تشکیک اور انحراف کے مرض میں مبتلا ہے تو اس کی شاعری میں بھی اس کا عکس نظر آئے گا اور اگر وہ ایمان، یقین اور عرفان کی دولت سے مالا مال ہے تو اس کی شاعری بھی اس تاثیری قوت سے روشن ومنور ہوگی۔تاثیر میں شدت جذبے کی شدت اور فراوانی سے پیدا ہوتی ہے۔جذبہ دراصل دل کے احساس اور وجدان

کی اس کے کیفیت کا نام ہے جو الفاظ میں رنگ ،نور اور خوشبو بھرتا ہے اور الفاظ کو عکسی تصویر پردان کرتا ہے۔ جذبہ جتنا شدید ہوتا ہے الفاظ اسی قدر کیفیت میں جلوہ سامانی اور تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ حفیظ میرٹھی کے کلام میں جذبے کی شدت اس قدر شدید ہے کہ اس نے ان کے کلام کو Multi-Dimention دوآتشہ بلکہ سرتاپا آتشہ بنادیا ہے۔

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ حفیظ کے کلام کی از سرِ نو پرکھ کی ضرورت ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ان کے کلام کی قرأت بچشم سر نہیں بچشم دل کیجئے۔ان کے کلام کی تلاوت بدیدۂ نم کیجئے، جذبۂ دل کو مہمیز کیجئے ،ان کے اشعار کو پڑھئے ،گنگنایئے ،گنگناتے جایئے ،آنکھیں بند کرکے وہاں تک جایئے جہاں تک یہ اشعار آپ کو لے جانا چاہتے ہیں۔

چاہے تن من سب جل جائے
سوزِ دروں پر آنچ نہ آئے
شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے
جس کو ہو کہنی دل کی کہانی
سرتا پا دھڑکن بن جائے
ہائے وہ نغمہ جس کا مغنی
گاتا جائے روتا جائے
کاش ہمارا فرضِ محبت
عیشِ محبت پر چھا جائے

حفیظ میرٹھی کے یہاں سوزِ دروں سے سوزِ دل اور سوزِ جگر مراد ہے جو غمِ آگہی، عرفانِ حیات وکائنات اور معرفتِ ربِّ کائنات سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ غمِ آگہی ہے جو اپنا تن من سب جلا کر سوزِ دروں کو بچانے کا تمنائی ہے۔یہی سوزِ دروں ہے جس کی بھٹی میں تپ کر مشت خاک انسانیت کی معراج حاصل کرتی ہے۔وہی مشت خاک جو ملائک کی مسجود بھی ہے اور وجہِ تخلیق معمورۂ معبود بھی۔حفیظ کے یہاں غمِ آگہی سوزِ دل اور سوزِ دروں کی صورت میں فرضِ محبت بن جاتا ہے۔وہی فرضِ محبت جو خاصۂ کارِ رسالت بھی ہے۔ظاہر ہے جو جو فرضِ محبت کا سودائی ہو اسے عیشِ محبت سے کیا کام۔ایک بار پھر پڑھئے ؂

چاہے تن من سب جل جائے
سوزِ دروں پر آنچ نہ آئے

کاش ہمارا فرضِ محبت
عیشِ محبت پر چھا جائے

آپ ان اشعار کی تلاوت ٹھہر ٹھہر کر ترتیل کے ساتھ کیجئے، تنہائی میں آہستہ آہستہ بار بار دہرائیے۔ آپ کی گنگناہٹ غمِ حیات وکائنات سے ہم آہنگ ہوتی محسوس ہوگی۔ احساسِ فرضِ محبت سے پیدا ہونے والا سوزِ دروں پھیلتے پھیلتے پوری کائنات کو اپنی آغوش میں لے لے گا، شکستہ دل سوزِ دروں میں ڈھل کر آپ کی زندگی کا نغمہ بن جائے گا، آپ کا فرضِ منصبی بن جائے گا، فرضِ محبت بن جائے گا۔ دراصل یہی فرضِ محبت حفیظ کی شاعری کا ماحصل ہے۔ ان کی شاعری ہو یا ان کی زندگی، ان کے یہاں عیشِ محبت کا کوئی خانہ نہیں۔ ان کی پوری شاعری کا امتیاز یہی فرضِ محبت ہے۔ غمِ ذات ہو یا غمِ حیات وکائنات، یہی فرضِ محبت انہیں عرفانِ ذات وکائنات اور معرفت رب کائنات سے روشناس کراتا ہے۔ کوئی کافر ذہن ہی ان اشعار کی معنویت اور ان کی موسیقیت سے انکار کرسکتا ہے۔ ان اشعار میں جو تغزل ہے وہ بدن کی جمالیات سے لذت کشید کرنے والوں کے لیے درسِ عبرت بھی ہے اور نمونہ تقلید بھی۔ حفیظ کی غزل کی یہی نغمہ آفرینی ہے جسے طائفوں اور طوائفوں کی نہیں، ساز اور سازندوں کی نہیں، سوزِ دروں کی ضرورت ہے۔ یہی وہ نغمہ ہے جس کا مغنی ہی نہیں روتا اس کو سننے والا بھی آبدیدہ ہوجاتا ہے۔ شاید اسی شاعری کو ''جزویست از پیغمبری'' اور شاعر کو ''تلمیذ الرحمٰن'' کہا گیا ہے۔ فرضِ محبت جب حرزِ جاں بنتا ہے تو نظر نظیر، بصارت بصیرت اور غزل عبادت بن جاتی ہے اور ظاہر ہے عبادت پاک من اور پاک تن کی طلبگار ہوتی ہے، اسے عیشِ محبت کے طلبگاروں سے کیا علاقہ۔

یہی نہیں بلکہ حفیظ راہِ حق کے متوالوں کے لیے سنگ میل بھی متعین کرتے ہیں، راہِ حق میں پیش آنے والی صعوبتوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں، اس کے آداب وشرائط بھی واضح کرتے ہیں، رہبر اور رہزن کا فرق بھی بتاتے ہیں، لیکن کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ انہوں نے غزل کی روایتوں سے انحراف کیا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے یہاں تغزل بھی باحیا، باکردار اور باحجاب آتا ہے، جس سے غزل اور تغزل اور بھی بااثر ہوجاتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیں۔

کارواں چاہے مختصر ہوجائے
کوئی رہزن نہ ہم سفر ہوجائے
خام اب بھی نہیں ہے عشق مگر
چوٹ کھالے تو پختہ تر ہوجائے

اس فریبِ سکون و راحت پر
اتنا ہنسئے کہ آنکھ تر ہوجائے
راہ روکے ہوئے خود راہ نما بیٹھے ہیں
اب کوئی قافلہ گزرے تو کدھر سے گزرے
اُف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گزر سے گزرے

حفیظ کے اشعار اشعار نہیں، متاعِ آخرِ شب ہیں۔ آپ آخرِ شب کی نرم وگداز ساعتوں میں انہیں گنگنایئے وہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر نئے جہانوں کی سیر کرائیں گے۔ آپ کو معنویتوں کے نئے آفاق اور نئے افلاک کا ادراک ہوگا۔ حفیظ کی شاعری میں الفاظ معنویت کی توسیع کرتے نظر آتے ہیں۔ معانی ومفاہیم الفاظ سے خود بخود باہر آنے کو بے تاب دکھائی دیتے ہیں، جس طرح بچے چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی اسکول سے باہر آنے کو بے تاب ہوتے ہیں۔ حفیظ کی شاعری میں بین المتون اور بین السطور میں معانی ومفاہیم کی تلاش کارِعبث ہے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے اشعار ٹھیک آپ کے درِدل پر دستک دیتے ہیں۔ کسی رمزیت اور ایمائیت کی ضرورت نہیں۔ رمزیت، ایمائیت اور بین المتونیت کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب شاعر وادیب کے اندر جرأتِ رندانہ کا فقدان ہوتا ہے، اور اسے اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ وہ اگر سچی بات کہے گا تو شہریاروں کے عتاب کا شکار ہوجائے گا، لیکن حفیظ میرٹھی اس خوف سے بالکل بے پروا نظر آتے ہیں، اس لیے رمزیت اور ایمائیت ان کے شعری تگ وتاز کو راس نہیں آتی۔ حفیظ جرأتِ رندانہ سے نہیں جرأتِ مومنانہ سے متصف ہیں۔ وہ صاف کہتے ہیں۔ ایک شعر نہیں پوری غزل سے لطف اٹھایئے۔ سہل ممتنع کی یہ غزل سنئے اور داد دیجئے۔ اتنی بلند خیالی اور الفاظ کی اتنی جزرسی کے ساتھ۔ یک رنگی میں نیرنگی یہ صرف حفیظ کے لیے ہی خاص ہے ۔

سوز نہ ہو تو سازِ حیات
بس اک روکھی پھیکی بات
جل اٹھ جل اٹھ شمعِ یقیں
رات ہے اور اندھیری رات
جان ہتھیلی پر رکھ لے
کہنی ہے گر سچی بات

معصوموں پر آئے ہیں
کیسے کیسے الزامات
کوئی ہنسے کوئی روئے
یہ اپنے اپنے حالات
نامحکم بنیادِ ہوس
عشق سراپا صبر وثبات

حفیظ کی غزل میں سچائیاں صبحِ صادق کی طرح ابھرتی اور تاریکیوں کو زیر کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ان کے کلام میں عہد کی سچائیوں اور تلخیوں کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب، اسلامی تاریخ اور صالح اقدار پر مبنی نظامِ حیات کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔

پھول تو رہ گئے کیسۂ زر لیے
اور شبنم نے موتی لٹا بھی دیئے
ان کے جانے کا منظر تماشا نہیں
دور تک دیکھئے دیر تک سوچئے
ساز وآواز کے دورِ پرشور میں
عشق کی بے نوائی کو کیا کیجئے
ہم تو دیوانے ٹھہرے ہمیں کیا خبر
جانے کیوں ہنس پڑے جانے کیوں رودیئے
درد پر تبصرہ تو بہت ہوچکا
درد کو آپ محسوس بھی کیجئے

حفیظ کو پڑھئے آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے اشعار میں درد پر تبصرہ نہیں کرتے بلکہ درد کا احساس کراتے ہیں، اور حفیظ زندگی بھر یہی فریضہ انجام دیتے رہے۔

یہی وہ درد تھا جس کا احساس کرانے کا فرض ادا کرتے ہوئے انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔لیکن وہ قید و بند کے خوف سے چپ نہیں ہوئے۔جیل سے باہر آتے ہی انہوں نے پہلے سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کی، جس کے نتیجہ میں انہیں دوبارہ میسا کے تحت گرفتار کر کے غیر معینہ مدت کے لیے جیل کی آہنی دیواروں کے پیچھے ڈال دیا گیا مگر وہ وہاں بھی خاموش

نہیں ہوئے۔وہ وہاں بھی اسی کام میں لگے رہے۔ان کی انہی غزلوں کی وجہ سے ان پر ترقی پسندی سے متأثر ہونے کا الزام بھی لگا۔بعض لوگوں نے دبے لفظوں میں اور کچھ نے کھلم کھلا کہا کہ یہ روایتی غزل سے بغاوت ہے، یہ اشتہاریت ہے، یہ حفیظ کا رنگ نہیں ہے۔یہ ترقی پسندی کے اثرات ہیں، لو حفیظ بھی ترقی پسند ہو گئے۔ان میں وہ لوگ پیش پیش تھے جو ظالم و جابر حکمرانوں کے خوف سے گھروں میں دبک گئے تھے، ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے فن کی حرمت کو پامال کرتے ہوئے حکومت وقت کی شان میں قصیدے پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ترقی پسندی تھی نہ اشتہاریت، بلکہ وہ حق کی واشگاف آواز تھی جو موقع اور ماحول کی نزاکتوں کو محسوس کر کے بلند کی گئی تھی۔ایسے وقت میں حفیظ میرٹھی نے حق کی آواز بلند کی، حق کو حق کہا اور باطل کو باطل۔اس وقت اشارے کنایے، رمزیت اور ایمائیت کی ضرورت نہ تھی۔اس لیے انہوں نے برملا ظالم کو ظالم کہا، بانگ دہل کہا، اس سرزمین پر کہا جہاں ظلم و جبر کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔انہوں نے اپنے اوپر خود ساختہ جلا وطنی طاری نہیں کی، وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر ماسکو گئے نہ لندن، بیروت گئے نہ واشنگٹن۔انہوں نے اپنے لیے محفوظ پناہ گاہیں نہیں ڈھونڈیں کمیں گاہوں میں بیٹھ کر کمان نہیں سنبھالی، بلکہ میدانِ کارزار میں اپنے فن اور اپنے ہنر کو لے کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایستادہ ہو گئے۔اس وقت فن کے ہنر کا یہی تقاضا تھا انہوں نے نہ صرف فن کی لاج بچائی بلکہ اہل فن کی آبرو بھی رکھی کیونکہ حق پرستوں کا سدا سے یہی شیوہ رہا ہے۔انہوں نے وہی روِش اختیار کی جس کا اظہار وہ پہلے کر چکے تھے۔

جان ہتھیلی پر رکھ لے
کہنی ہے گر سچی بات

بلکہ اس سے بھی واضح انداز میں وہ اپنی شاعری کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہہ چکے تھے۔

کوئی مرحلہ ہو کوئی معرکہ ہو
نظر عارفانہ، قدم غازیانہ
حفیظ اس میں کردار کی جھلکیاں ہیں
نہیں شاعری یہ فقط شاعرانہ

اس وقت جبکہ ملک میں ایمرجنسی کی کالی اور مہیب رات طاری تھی، سیاست کے ایوانوں ہی میں نہیں شعر و ادب کی فضاؤں میں بھی نہ ٹوٹنے والا سناٹا طاری تھا، سچ بات کہنے، حق کی حمایت کرنے، ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کا کسی کو یارا نہ تھا۔بے شمار لوگ گرفتاری کے خوف سے روپوش ہو گئے تھے۔

ہر شخص ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر نظر آتا تھا، ہر زبان خاموش تھی، ہر لب پر مہر لگی ہوئی تھی، ہر جنبش لب پر پہرے تھے، قلم کی سیاہی خشک ہو چکی تھی۔ ایسے آزمائشی حالات میں حق وانصاف کی حمایت میں، ظلم وناانصافی کے خلاف جبر وتشدد کی علامت بن چکی حکومت کے منظور نظر اعلیٰ افسران اور حکومت کے سربراہان کی موجودگی میں میرٹھ کے آل انڈیا مشاعرے میں حفیظ میرٹھی کی بے باک اور بے خوف آواز گونجتی ہے، شعراء حضرات بارش میں بھیگے ہوئے پرندوں کی طرح پروں میں سر دبائے خاموش، ایک خوف کے عالم میں بیٹھے ہیں کہ دیکھیں اب کس کس کی شامت آتی ہے، مگر حفیظ کو کوئی خوف تھا نہ کوئی ہراس۔ سوزِ دروں میں ڈوبی ہوئی، ظلم وستم کو آئینہ دکھاتی ہوئی حفیظ کی مترنم آواز شاعری کے کوہِ فاراں پر کھڑے اہل وطن کے سامنے فرضِ کفایہ ادا کر رہی تھی۔

آج کچھ ایسا طے پایا ہے حق کے اجارہ داروں میں
ہم پر جو ایمان نہ لائے چنوادو دیواروں میں
کون سی ہے تصویر ہماری کاش بتادے کوئی ہمیں
چہروں پر چھائی ہے اداسی، رونق ہے بازاروں میں
سورج کو دو دیس نکالا، دن کا قصہ پاک کرو
بنتے ہیں ایسے منصوبے رات کے رشتے داروں میں
رازق پر کرتے ہیں بھروسہ اور نہ اپنی کوشش پر
خوش حالی کو ڈھونڈ رہے ہیں جو خالی گہواروں میں
اک جابر کا مجبوروں نے ایسے استقبال کیا
آ نکلا ہے کوئی مسیحا جیسے درد کے ماروں میں
ہر ظالم سے ٹکر لی ہے سچے فن کاروں نے حفیظؔ
ہم وہ نہیں جو ڈر کر کہہ دیں ''ہم ہیں تابعداروں میں''

حفیظ نے ظلم کو ظلم اور باطل کو باطل کہنا سکھایا، ظالم کو علی الاعلان ظالم کہنے کی جرأت دی، حق گوئی کا حوصلہ دیا، ضرورت پڑی تو مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ وساغر کے حوالے سے کی اور عزیمت کی گھڑی آئی تو جان ہتھیلی پر رکھ کر رموزِ جہاد کے اسباق بھی دہرائے۔

نایاب خطوط

گزشتہ شمارے میں محترمی ومکرمی جناب رضوان احمد فلاحی صاحب (لندن) کے مرتب کردہ خطوط بعنوان ''مشاہیر کے خطوط۔مولانا جلیل احسن ندویؒ کے نام'' کی دوسری قسط شائع کی گئی تھی،اس کی اگلی قسطیں آئندہ شماروں میں ملاحظہ فرمائیں۔
ذیل میں ماہر قرآنیات مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی صاحب (حفظہ اللہ ورعاہ) کے دو خطوط بنام پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب (ناظم دارالمصنفین،اعظم گڑھ) اور مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب مرحوم شامل اشاعت کیے جارہے ہیں۔
توفیق خداوندی شامل حال رہی تو اس کالم کے تحت آئندہ بھی اہم اور نایاب خطوط کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا رہے گا۔ **(مدیر)**

(۱)

بنام ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی صاحب، علی گڑھ

باسمہ وبحمدہ

عزیز گرامی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید کہ بخیر ہوں گے۔عرصہ ہوا اشتیاق نامہ موصول ہوا تھا،رقم کے بارے میں میں نے اسی وقت شفیق صاحب کو لکھ دیا تھا جس کی اطلاع بھی وہ آپ کو کر چکے ہیں۔خدا کرے اب وہ رقم بھی فراہم کر چکے ہوں۔میں نے چند روز پہلے سلامت اللہ کو خط لکھا ہے اگر ابھی تک انتظام نہ ہوا ہوگا تو امید ہے کہ اب جلد ہی ہو جائے گا۔

آج پہلی بار اشفاق عالم صاحب کے نام الہدیٰ کا شمارہ آیا تو اسی میں باہر سے پرواز اصلاحی صاحب کے انتقال کی خبر نظر آئی۔اللہ تعالی مغفرت فرمائے۔میرا ان سے کوئی خاص ربط نہ رہا تھا پھر بھی ان کی شخصیت اصلاحیوں کے درمیان بساغنیمت تھی، اللہ تعالی ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ان کے اعزہ واقارب کے بارے میں تو

مجھے معلومات ہی نہیں، اصلاحی برادری کی تعزیت آپ کے واسطے سے کر رہا ہوں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ لوگوں نے جس کوچہ میں قدم رکھا ہے اسے اگر کوچۂ رسوائی سمجھ کر رکھا ہے تو ہم جیسے نااہلوں کو میر کارواں بنانے میں کوئی قباحت نہیں لیکن اگر رزم گاہ حیات میں قدم رکھنا ہو تو کسی باصلاحیت شخص کا انتخاب ہونا چاہیے۔ رہی فکر فراہی بروایت مولانا اختر احسن مرحوم والی بات تو اس کا امین ہونے کا شرف اس گنہگار کو کبھی بھی حاصل نہیں ہوا۔ یہ بات یقیناً میرے لیے باعث شکر ہے کہ اللہ تعالی نے مجھے مرحوم کی صحبت میں کچھ عرصہ رہنے کی سعادت نصیب فرمائی اور اس نے میرے فکر وعمل پر کچھ خوشگوار اثرات بھی چھوڑے۔ لیکن میں اس وقت اپنی ذہنی ناپختگی اور ناہموار صحت کی وجہ سے اس قابل نہ تھا کہ ان کے افکار یا روایات کو پوری طرح محفوظ کر سکوں یا ہضم کر سکوں۔ اسی وجہ سے میں شاید ہی کبھی اس کی جرأت کرتا ہوں کہ مرحوم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہوں۔ بعد کے حالات بھی آپ کو معلوم ہیں کہ کبھی اس کا موقع بھی نہ ملا کہ مولانا فراہی کے مطبوعہ افکار وخیالات ہی کا یکسوئی سے مطالعہ کیا جائے اور پھر اس نہج پر کچھ کام کو آگے بڑھایا جائے ؎ یک کاش کے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم۔

امید ہے کہ پہلا شمارہ منظر عام پر آ گیا ہوگا۔ اجمل صاحب مولانا فراہی کے ایک پرانے مضمون کو نئے ترجمہ کے ساتھ شائع کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے، امید ہے کہ وہ آپ لوگوں کو مل چکا ہوگا۔ مولانا شہباز صاحب امید ہے کہ کلی طور پر صحت یاب ہو چکے ہوں گے لیکن معلوم نہیں اب وہ فکر فراہی کی نمایندگی کرنا پسند کریں گے یا فکر ندوی کی، بہرحال اللہ تعالی انہیں صحت وعافیت عطا فرمائے اور ہم سب کو اپنی کتاب سے تعلق استوار کرنے اور اس کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی سعادت نصیب فرمائے۔

احباب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ مولانا اشفاق عالم کو پس نوشت دکھا دیا ہے لیکن اس کے لیے ان کو براہ راست یاد دہانی کرنی پڑے گی۔

والسلام علیکم

امانت اللہ ۱۴۰۵/۶/۲۶ھ

(۲)

بنام مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب مرحوم، علی گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادر مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مودت نامہ موصول ہوا۔ امید ہے کہ مجلّہ کے شمارے نائیجریا میری روانگی کے بعد پہنچ گئے ہوں

گے۔ مجھے اجمل صاحب سے ایک شمارہ مل گیا تھا لیکن پڑھنے کی نوبت نہ آئی۔ اس سے پہلے ایک اور شمارہ ملا تھا جس پر سرسری نگاہ ڈال لی تھی لیکن اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اس پر کوئی تبصرہ کروں۔ جب تک چند اصحاب قلم کا مستقل تعاون نہ حاصل ہو اس وقت تک معیاری پرچہ نکالنا مشکل ہی نہیں مستحیل ہے۔ ابھی آپ اس پوزیشن میں ہیں ہی نہیں کہ انتخاب کر کے پرچہ مرتب کریں اس لیے مجبوری ہے، لیکن اس کا ضرور خیال رکھیں کہ معیار جو بھی ہو ایسے مضامین کو جگہ نہ دیں جن کا مقصد سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس شمارے میں کچھ اس طرح کے مضامین نظر آئے تھے۔

مجھے افسوس ہے کہ اجمل صاحب کا مضمون میں دیکھ کر ابھی تک نہیں دے سکا ہوں۔ ان شاء اللہ یہ کام کسی نہ کسی طرح کرنے کی کوشش کروں گا۔ عربی متن دینے کی ضرورت نہیں۔ اس کا معیار بھی کچھ زیادہ بلند نہیں ہے اور اس متن کی اشاعت کی کوئی خاص افادیت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ میرے خیال میں فی الحال اس کا اپنا عنوان کافی ہوگا۔ اگر افادات فراہی کے نام سے کوئی سلسلہ شروع کرنے کا پروگرام ہو تو یہ عنوان دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

آپ کو معلوم ہے میں نے کبھی مضمون نگاری کی ہی نہیں۔ یہاں آنے کے بعد مختلف موضوعات سامنے آتے رہتے ہیں اس لیے خواہش ہوئی کہ مطالعۂ قرآن کے عنوان سے سلسلۂ مضامین شروع کیا جائے لیکن موجودہ مشاغل کے ساتھ اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے بعد اگر کچھ فرصت میسر آئی تو ممکن ہے یہ خواہش پوری ہو جائے۔

میرے خیال میں ادارہ کے لیے کتب کی فراہمی کا مرحلہ بعد میں آئے گا، ابھی تو آپ دوسرے اداروں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جب اس کا اپنا ایک حلقہ بن جائے گا تو آہستہ آہستہ اس کی لائبریری بھی بن جائے گی۔ ابھی آپ کا کوئی ایسا ادارہ تو ہے نہیں جس میں مستقل تصنیف وتالیف یا تحقیق کا کام ہو رہا ہو اور اس کے لیے کتابوں کی فراہمی ناگزیر ہو۔

باہر رہتے ہوئے اور مشاغل میں گھرے رہنے کے ساتھ یقیناً کوئی قابل ذکر تعاون نہیں ہوسکتا۔ دعا فرمائیں اللہ تعالی سکون واطمینان کے ساتھ کچھ دنوں اپنی کتاب کی خدمت کا شرف عطا فرمائے۔ ظلی صاحب اور دیگر احباب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ والسلام علیکم

امانت اللہ

۳؍جمادی الاولی ۱۴۰۶ھ مدینہ منورہ

غزل

جذبہ شوق مرا جام شہادت مانگے
مہرباں میرا مرے دل کی عبادت مانگے

پھول کھلتے نہیں صحرا میں فقط چاہت سے
یہ عمل اور محبت میں ریاضت مانگے

آگ کیا پھول بنی اور کسی کی خاطر
عہدوپیمان ترا حسن رفاقت مانگے

میکشوں پر تری تنقید بجا ہے لیکن
محتسب تیرا بیاں شان بلاغت مانگے

درد بڑھتا ہے کہ اب حد سے گزر جائے گا
قلب بیمار فقط تیری عیادت مانگے

یوں بھی حل ہوتے ہیں دنیا کے مسائل زاہد
طرز گفتار ترا رنگ سیاست مانگے

سوچتے ہم ہیں کہ یوں ہوتا تو یوں ہوجاتا
زندگی جنگ ہے خالد کی قیادت مانگے

کب بدل جائے ان آنکھوں میں فضا کا منظر
موسم گل بھی ہواؤں کی شرارت مانگے

عقل نادان ہے احسان جنوں کیا جانے
حسن انجام تو جذبے کی صداقت مانگے

کیوں پریشاں ہو جو ڈوبے ہو ابھر جاؤگے
شعلہ طور بھی موسیٰ کی اجازت مانگے

بادوباراں کے فوائد سے نہیں ہے انکار
زندگی کھیت کی سورج کی تمازت مانگے

کچھ نہیں ہوگا شکایت سے زمانے میں امیںؔ
راہ پرخار ہے ایماں کی حرارت مانگے

محمد امین احسن، پربھنی

غزل

کیا جانے کیسا خوف بسا ہے فضاؤں میں
سورج ، ستارے ، چاند، چھپے ہیں خلاؤں میں
میں اپنی دھوپ سر پہ اٹھائے نکل پڑا
دنیا بہت بلاتی رہی اپنی چھاؤں میں
کل شب مرے مکاں میں عجب روشنی رہی
روشن تھا اک الاؤ کہیں دور گاؤں میں
مدّت ہوئی میں آچکا صحراؤں سے مگر
ذرّات اڑ رہے ہیں ابھی تک ہواؤں میں
کب تک پلٹ پلٹ کے تجھے دیکھوں زندگی
اب کچھ نیا نہیں ترے حیرت سراؤں میں
ویسے تو کچھ نہیں ہے مرے پاس آج بھی
اک آگ تھی، جو پھیلی ہے میری صداؤں میں

عزیز نبیلؔ،قطر

غزل

ہم دیوانے اب کے سارا نظم و نسق چلائیں تو!!
اہل خرد کی جانب سے بھی آ جاتی کچھ رائیں تو!
مجھ کو عشق آکاش میں اڑتے رہنا ہے پھر صدیوں تک
میرے نو آموز جنوں کے بال و پر اگ آئیں تو!
لرزیدہ قطروں کا پلکیں کب تک بوجھ اٹھائیں گی
چھٹکارا مل جائے ان سے آنکھیں موند لی جائیں تو!
دہشت کی پھر ایک نئی تاریخ رقم تو ہونی ہے
انسانوں کی جان سے بھی اوپر ہو جائیں گائیں تو!
رنگ برنگی اس دنیا میں کیا ہو مٹی کی اوقات
میں بھی جی اٹھوں جو ان کے ہاتھ مجھے چھو جائیں تو!
اندر کمرے میں خوشبو ہے کس کو ہے معلوم میاں
باہر کی دیواروں پر بھی پھول اگائے جائیں تو!
تو کیا اپنی آنکھ اُٹھا لوں رستے کی پہنائی سے
کرنے دو، کرتا ہے چھت پر کوا کائیں کائیں تو!
کیا ہوگا جب حسن سوالی ہو گا اپنی میت پر
کیا ہوگا جب عشق کرے گا آئیں بائیں شائیں تو!
شرم سے سورج، چاند، ستارے بادل میں چھپ جاتے ہیں
بچوں کی لاشوں پر صارمؔ روتی ہیں جب مائیں تو!

ارشد جمال صارمؔ، منصورہ، مالیگاؤں

تعارف وتبصرہ

فکروآگہی (جلداول)
ترتیب وادارت:ابوالاعلی سید سبحانی
صفحات:288،**قیمت**:150 روپے،**اشاعت**:2015ء
پتہ:ادارہ حیات نو، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی 276121
تبصرہ:سعید اختر اعظمی

افکار کی ترویج وترسیل شعور کی بیداری کے لیے ناگزیر ہے۔ دراصل یہ فرد یا اجتماعیت کی تحریک کے لیے لازمی بھی ہے تاکہ غور وفکر کی راہِ نو کا تعین کیا جاسکے۔ اختلاف رائے ہوسکتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ یہ قطعاً معیوب نہیں، کیونکہ ہر کسی کی اپنی الگ سوچ ہوتی ہے۔ حالات حاضرہ پہ نظر اور تبدیلی پہ فکرمندی کا اظہار حساس افراد کا شیوہ بھی رہا ہے اور ذمہ داری بھی۔ اسے بجا طور پر مشاہدات وتجربات کا آئینہ دار کہا جاسکتا ہے۔ ماہنامہ حیات نو کی ادارت سنبھالتے ہی ابوالاعلی سید سبحانی نے فارغین جامعہ کے فکری دریچوں کو اجالنے کی خاطر 'فکروآگہی' کا کالم شروع کیا جو تا حال مقبول کالموں میں شمار ہوتا ہے۔

'فکروآگہی' سہ ماہی سے ماہنامہ ہونے تک جاری رہنے والے متنوع موضوعات پر ماہنامہ حیات نو کے 9 کالموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ فی کالم 9رشرکاء نے اپنی آراء پیش کی ہیں جن میں سے معدودے چند کی ہی تکرار ملتی ہے۔ موضوعات کے مشمولات میں 'فارغین جامعہ کا مطلوبہ کردار'، 'امت کے داعیانہ کردار کی بازیافت، کیوں اور کیسے؟'، 'میڈیا کے بڑھتے اثرات اور مدارس کی ذمہ داریاں'، مدارس اسلامیہ اور ہندوستانی زبانوں کی تدریس'، 'ادب اسلامی کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کا کردار'، 'کاردعوت کے لیے فارغین مدارس کی تیاری'، 'دعوت اسلامی میں خواتین کا مطلوبہ کردار'، 'آزادئ رائے کی اہمیت اور اس کے لیے ماحول سازی میں علماء کا کردار' اور 'بچوں کی تربیت کے لیے مطلوبہ لٹریچر: صورت حال اور امکانات' پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں مرکزیت مدارس، علماء، دعوت وتبلیغ، تدریس اور ادب اطفال کی ہے جن کا ارتباط باہمی واضح ہے۔

مدارس اسلامیہ کے قیام کا بنیادی مقصد کردار کی صلابت ،فکری پختگی اور علمی رسوخ ہے۔فارغین کی یہ اولین ذمہ داری ہونی چاہیے کہ وہ اُن تعلیمات سے خاطر خواہ آشنا ہوں جن سے دشمنوں کی شرانگیزی کا راست جواب دے سکیں۔ذرائع ابلاغ اور میڈیا سے واسطہ رکھے بغیر یہ ممکن نہیں۔یہاں ادب اسلامی کے ساتھ ہندوستان کی مختلف زبانوں کی تدریس کا باقاعدہ نظم ہو۔آزادی رائے پہ قدغن نہ لگائی جائے اور انھیں تحریر وتقریر کی مشق کروائی جائے۔ادب اطفال کے رجحانات اور بچوں کی نفسیات پرنظر رکھتے ہوئے طلبہ کی تربیت ہو۔تبھی یہ کامیابی سے ہم کنار ہوسکتے ہیں۔

یہ مجموعہ اولین متنوع موضوعات کے باوجود نصب العین کے قدر مشترک کے سبب ایک علمی بحث کا آغاز ہے اور غور وخوض کرنے والوں کی آراء کی مختلف جہات کا آئینہ دار بھی۔

اک ذراسا بوجھ

شاعر:فرخ جعفری

صفحات:116

قیمت:200روپے

اشاعت:2014ء

پتہ:شب خون کتاب گھر 313رانی منڈی الہ آباد،یوپی

تبصرہ:سعید اختر اعظمی

ذات اور زندگی دو مختلف حوالے سہی مگران کا اتصال یقینی ہے۔اس کے لیے قنوطیت سے گریز اور تشکیک سے پرہیز ناگزیر ہے۔فرخ جعفری کے یہاں تشکیک تو ہے لیکن وہ شکوہ کناں ہونے والوں کی صف سے خود کو الگ رکھتے ہیں۔وہ مجبوریوں اور مشکلات سے دامن نہیں بچاتے بلکہ اس کے سامنے سینہ سپر ہوجانے میں عافیت سمجھتے ہیں۔شب تیرہ وتار ہو یا مہ کامل سے منور اُن کے لیے تہی کشکول نظر ہے اور اس دورانیہ میں پلکوں کی چلمن پہ قبضہ جما لینے والا خواب کھلی آنکھوں کا سفر۔بے مکانی انھیں اس لیے راس آتی ہے کہ وہاں امن وامان ہے۔اسی طرح دشت کو وہ بے در ودیوار کا گھر تسلیم کر کے خود کو مطمئن کر لیتے ہیں۔

کم گوئی وکم سخنی کو شعار بنانے والے فرخ جعفری نے 1960 کے آس پاس شعر گوئی کا آغاز کیا اور حال ہی میں تقریباً چھ درجن غزلیں شمس الرحمٰن فاروقی کے اصرار پہ قارئین کے روبرو کیں۔اس

سے قبل ایک مجموعہ منظر عام پہ آیا تھا جو شاید یاران بے تکلف کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ یہ کب شائع ہوا اور کس نام سے ہوا اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ صاحب سخن کی بیاض میں جو غزلیں محفوظ تھیں اسے یکجا کر کے یہ مجموعہ 'اک ذرا سا بوجھ' ترتیب دیا گیا ہے۔ عنوان کتاب شاعر کے جس شعر سے ماخوذ ہے وہ فکر کی دو متنوع جہات کا آئینہ دار ہے۔

اک ذرا سا بوجھ بھی فرخ لگے بھاری بہت　　　اور کاندھے پر کبھی بار گراں اچھا لگے

فرخ جعفری کے پرواز تخیل اور زاویہ نظر کے آہنگ ملاحظہ فرمائیے ؎

مہماں سرائے جاں میں کوئی ٹھہرتا نہیں　　　جب سے چلا گیا اسے کوئی اجاڑ کر

....

شہر کی سرحد تلک پہنچا کے سب رخصت ہوئے　　　اب یہاں سے بس مرے ہمراہ صحرا جائے گا

....

کوئی تو گرمی احساس سے ملتا اس سے　　　اتنے دن بعد تو وہ لوٹ کے گھر آیا تھا

....

کسی کو یاد نہ کرنے پہ کر دیا مامور　　　سزا کے طور پر دل کو ذرا ستانا تھا

....

اب شہر کی خاموشی ویرانے سے ملتی ہے　　　آواز لگائی تو بولا ہی نہیں کوئی

صاحب سخن کی تعلیٰ میں خاکساری کا رنگ نمایاں ہے۔

اک شعر کہہ کے خوش تھے کہ کیا شعر کہہ دیا　　　اب سوچتے ہیں یہ بھی کوئی کام کیا ہوا

....

فرخ کے شعر اس نے سنے تو کہا کہ خوب　　　ہم تو اسے سمجھتے تھے یونہی، مگر نہیں

فرخ جعفری کے سلیس، سادہ و سہل اشعار جذبات دل کے ترجمان ہیں اور لفظوں کی تلاش بے کنار کا اعلامیہ بھی۔

ترے سکوت کو کوئی یہاں نہ سمجھے گا　　　عجب نہیں کہ یہ غم تجھ کو بے زباں کر دے

بہت دنوں سے میں اس کی تلاش میں گم ہوں　　　وہ ایک لفظ جو فرخ مجھے بیاں کر دے

آپ کے خطوط

محمد صادق ظلی فلاحی، نئی دہلی

جریدہ حیات نو کے مدیر قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ''ملت کی تعلیمی ترقی۔طریقہ کار کیا ہو؟'' جیسے اہم موضوع کو''فکرو آ گہی'' کالم کے لیے منتخب کیا۔امید کی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ کچھ بہت ہی مضبوط اور پائیدار نشانِ راہ کی طرف پیش قدمی ہوگی اور مستقبل میں انہی خطوط پر چل کر ملت کی مجموعی تعلیمی صورتحال کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کوشش کو ثمرآور کرے اور جن مقاصد کے تحت اس موضوع کو اہل علم کے درمیان موضوع بحث بنانے کی کوشش کی گئی ہے وہ مقاصد حاصل ہوں۔اللہ ہماری مدد ونصرت فرمائے، آمین۔

محمد دانش فلاحی، نئی دہلی

برادرم،سلام مسنون

مفیداوراہم مضامین سے بھرپور ماہ اپریل اور مئی کے حیات نو سامنے ہیں۔

ماہ اپریل کے شمارے میں مصری عالم ڈاکٹر صلاح سلطان کا خونِ جگر سے تحریر کیا گیا علماء ہند کے نام پیغام بہت ہی اہم ہے۔اس پیغام کو کتابچے یا پمفلٹ کی صورت میں شائع کرکے زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ایک ایک جملہ اور ایک ایک پیراگراف بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''لازم ہے کہ ملک کی تعمیر میں ہمارا رول سیکولر دھاراؤں اور پارٹیوں سے بھی زیادہ نمایاں ہو، وہ وطن دوستی اور اس کے تقاضوں کی تجارت کرتے ہیں، اور انہیں بازار سیاست میں نیلام کرتے ہیں، ہم اپنی جدوجہد اور اپنی اپروچ سے ایک زندہ ثبوت پیش کریں۔۔۔۔۔۔

علماء کی ذمہ داری ہے کہ فکروشعور اور دعوت وتحریک میں پوری امت کے آگے آگے چلیں، تاکہ

امت کی راہ روشن رہے، اسے اکثریتی دھارے میں ضم ہوجانے سے بچایا جاسکے، اور شہادت حق کی عظیم ذمہ داری ادا کرنے کی طرف اسے آگے بڑھایا جائے۔''

اللہ تعالی ڈاکٹر صلاح سلطان کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے اور ان کو زیادہ سے زیادہ دین کی خدمت انجام دینے کی توفیق عنایت فرمائے۔

ماہ مئی میں ملت کی تعلیمی ترقی سے متعلق موضوع خاصا اہم ہے۔اس کو کئی شماروں تک جاری رہنا چاہیے، اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے فلاحی برادران کو اس مباحثہ میں کھل کر حصہ لینا چاہیے، اور مباحثے کو عملی رخ دینے کی کوشش کی جانی چاہیے۔تازہ مباحثے میں عملی رخ تھوڑا دبا دبا سا معلوم ہوا۔

''فکر و آگہی'' کالم کے تحت کئی کئی ماہ کے موضوعات کا پیشگی اعلان بہت ہی مناسب لگا۔ البتہ فکر و آگہی کالم ادھر چند ماہ سے کچھ کچھ وقفے کے بعد آتا ہے۔ یہ حیات نو کا بہت ہی دلچسپ کالم ہے، جس کے موضوعات بھی دلچسپ ہوتے ہیں اور ان موضوعات پر مختصر مختصر تحریریں بھی دلچسپ ہوتی ہیں۔اس کالم پر مزید محنت اور توجہ درکار ہے۔کوشش رہنی چاہیے کہ ہر ماہ پابندی کے ساتھ یہ کالم شائع ہوتا رہے۔

تازہ شماروں میں ڈاکٹر امتیاز وحید صاحب کی ترانۂ فلاح پر قسط وار تحریریں متعلقین جامعہ کے لیے یک گونہ اہمیت رکھتی ہیں۔نئی قسطوں کا انتظار رہتا ہے۔اس سلسلۂ مضامین میں ان ترانوں اور نظموں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جو تقریبا ہر سال جامعہ کے فارغین و فارغات کو الوداع کہنے کے لیے لکھی یا لکھوائی جاتی ہیں۔

رب دو جہاں ہم سب کو دونوں جہان کی کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔

نئی میقات میں یونٹس کا انتخاب

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کے مقامی یونٹس کے انتخاب کے سلسلے میں موجودہ یونٹس کے صدور اورانتخاب کروانے والے ذمہ داران کو خطوط اور فون کے ذریعہ اطلاع کی گئی۔ جس کے نتیجے میں مدینہ منورہ، ریاض، قطر، جامعۃ الفلاح اور کیرالہ یونٹ کا انتخاب عمل میں آچکا ہے۔ نئے ذمہ داران حسب ذیل ہیں۔

ریاض۔

صدر یونٹ: انعام اللہ فلاحی اعظمی

صدر یونٹ کی معاونت کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے، جس کے ارکان حسب ذیل ہیں:

(۱) عزیر ملک فلاحی

(۲) شکیل فلاحی

(۳) جاوید سلطان فلاحی

(۴) صابر شیبی فلاحی

(۵) جنید احمد فلاحی

(۶) مرزا سلمان بیگ فلاحی

مدینہ۔

صدر یونٹ: محمد اقرار فلاحی (گونڈہ)

سکریٹری یونٹ: سعود اختر فلاحی (سنبھل، مرادآباد)

خازن یونٹ: عبید اللہ طاہر فلاحی (بلریا گنج، اعظم گڑھ)

قطر۔

صدر یونٹ: محمد اکرم فلاحی

نائب صدر: آزاد اقبال فلاحی

سکریٹری یونٹ: فیاض احمد فلاحی

نائب سکریٹری: نیاز احمد فلاحی

خازن یونٹ: افضال احسن فلاحی

جامعۃ الفلاح

صدر یونٹ: مولانا کمال الدین فلاحی

سکریٹری یونٹ: مصباح الباری فلاحی

خازن یونٹ: عبدالعظیم فلاحی

کیرالہ۔

صدر یونٹ: ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن فلاحی مدنی

سکریٹری یونٹ: سدید ازہر فلاحی

خازن یونٹ: محمد ندیم فلاحی

سکریٹری انجمن مولانا انعام اللہ فلاحی صاحب کی جانب سے جاری کردہ سرکلر کے مطابق ''بعض وجوہ کی بناپر جن مقامات پر ابھی تک انتخابات نہیں ہوئے ہیں، وہاں سے موصول اطلاع کے مطابق عید الفطر کے بعد (۱۰ر جولائی ۲۰۱۷ء) تک انتخابات ہو جائیں گے، ان شاء اللہ۔ امید ہے تمام حضرات اپنی اپنی یونٹس کے امور میں دلچسپی کا مظاہرہ کریں گے اور انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کو اپنے مفید مشوروں سے نوازیں گے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو، آمین''۔

افسوس ناک خبر

یہ خبر باعث صد افسوس ہے کہ برادر مخدوم منہاج الدین فلاحی (فضیلت ۲۰۰۰ء) داؤدنگر، اورنگ آباد بہار کا وسط مئی ۲۰۱۷ء میں اچانک بلڈ پریشر کے حملہ میں انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

سکریٹری انجمن مولانا انعام اللہ فلاحی نے تعزیتی تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم کی غرض سے موصوف کا دہلی میں کئی سال قیام رہا۔ برادرم کا مزاج دینی تھا۔ اخلاق و کردار میں صالحیت تھی۔ اپنی وضع و قطع میں ایک عالم دکھائی دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے۔ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔